اگست 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور لندن

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

اس شمارہ میں

درسِ قرآن کریم	04
اداریہ	05
قائداعظم اور مسلم لیگ کے کارکن ابوالحسن اصفہانی اور دیگر کی کہانی	07
پاکستان جب صنعتی اور زرعی لحاظ سے خود کفیل تھا	09
عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہئے	10
مفتی عزیز الرحمان تنہا قصوروار نہیں ہے	11
آپ اگر پاکستانی ہیں تو یہ سبق یاد رکھیں	13
ہے کوئی فکر یوسف کا خریدار؟	15
پڑھی لکھی پارلیمنٹ	16
تعصب ہمیں کسی کروٹ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا	18
مذہب سے دوری اور معاشرتی پستی	20
یہ آدمی عجیب ہے عجیب بھی ہے کس قدر	21
تاریخ کے جھروکوں سے	22
مولوی اور مدارس	25
جب انگریزوں نے فی کس کشمیری کو تین روپے میں بیچ دیا	27
غلام فریدا اوھدی اوہ جانے	31
ہفت روزہ ''لاہور'' روزنامچے کی اشاعت کے بعد	32
گینز بک میں مزید چار پاکستانی نام	34
فوٹ ولیم کالج	35
برطانیہ کے غریب ترین پیر	38
ایسے ہوتے ہیں محبت نامے	39
عالمگیریت اور تاریخ: دنیا میں تاریخ نویسی کیسے بدل رہی ہے؟	40
مسلمانوں کی تخلیقی اذہان کی مغرب منتقلی (برین ڈرین)	41
مغرب میں اسلاموفوبیا	42
کرونا کے دنوں میں محبت	43
تہذیب یافتہ سینما کا عہد تمام ہوا	45
امریکا سیاسی تصفیے سے پہلے ہی افغانستان سے فرار کیوں ہوا؟	47
صدیوں سے اخلاقیات کا درس دیتی روشن روشن حکایات سعدی	51
آج کے ظالم مسلمان	54

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

ہُوَالــــــــــــــــــــــــنَاصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم　　گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 08 ذی الحجہ/محرم 1442-43 اگست 2021

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
ابن الامین (برطانیہ)
ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
عجب خان (بیورو چیف بلوچستان)
عابد شمعون چاند (سعودی عرب)
محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)
محمد عرفان (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)
چوہدری مقبول احمد (بھارت)
انس احمد (بیورو چیف لاہور)

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ **لاہور** میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

درس قرآن کریم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ فَاِنۡ
تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ
الۡاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ۝٦٠ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ
اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ
اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ وَ يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ۝٦١

(سورۃ النساء آیت ٦٠، ٦١)

ترجمہ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حکام کی بھی۔ اور اگر تم کسی معاملہ میں (اُولوالامر سے) اختلاف کرو تو ایسے معاملے اللہ اور رسول کی طرف لَوٹا دیا کرو اگر (فی الحقیقت) تم اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ یہ بہت بہتر (طریق) ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ کیا تُو نے ان لوگوں کے حال پر نظر کی ہے جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تجھ پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ فیصلے شیطان سے کروائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ اُنہیں دُور کی گمراہی میں بہکا دے۔

تفسیر

اس آیت کریمہ میں اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ میں مِنۡکُمۡ کا ترجمہ کرتے ہوئے بعض علماء یہ استنباط کرتے ہیں کہ مسلمانوں ہی میں سے اپنا حاکم بناؤ اور غیر مسلم حاکم کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک لغو عقیدہ ہے جو عمومی نظر ڈالنے سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ سب مسلمان جو غیر مسلم حکومت میں بستے ہیں یا وہاں ہجرت کر جاتے ہیں وہ ان کی حکومت کے قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جو مسلمان حاکم ہو اس سے کسی معاملہ میں تنازعہ کا کیا سوال ہے جس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے۔ یہاں اللہ اور رسول سے واضح مراد قرآنی تعلیم ہے۔ پس کوئی بھی حاکم ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، اگر قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلافِ عمل کرنے کا حکم دے تو ایسی صورت میں قرآن کی بات ماننا ہو گی نہ کہ حاکم کی۔

(اُردو ترجمہ قرآن صفحہ ١٤٠)

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں نے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی حضور کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا جسے آپ نے ذبح کیا۔ ذبح کرتے وقت آپ نے یہ الفاظ کہے:

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اے میرے خدا! یہ قربانی میری طرف سے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے جو قربانی نہیں کر سکتے قبول فرما۔

(ترمذی کتاب الاضحیٰ)

❁❁❁

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملا ہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہو گی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

❁❁❁

پاکستان کا یومِ آزادی 14 اگست یا 15 اگست؟

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

پاکستان میں یہ عام تاثر بھی ہے کہ ہمارا ملک برصغیر میں بھارت سے ایک دن پہلے دنیا کے نقشے پر اُبھرا تھا۔ اگر تاریخی دستاویزات پر نظر دوڑائی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ بھارت اور پاکستان 15 اگست کو ایک ہی دن برطانوی حکمرانی سے آزاد ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے اگر بھارت اور پاکستان دونوں ایک ساتھ وجود میں آئے تو پاکستان اپنی سالگرہ 14 اگست کو اور بھارت 15 اگست کو کیوں مناتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جس دن پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرا وہ نہ صرف جمعۃ المبارک کا بابرکت دن تھا بلکہ رمضان کی 27ویں تاریخ بھی تھی۔ اگر 1947ء کے ہجری نقشے پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 14 اگست کو جمعہ نہیں جمعرات تھی اور اُس دن رمضان کا روزہ 26واں تھا۔ ہمارے بزرگ یہی بتاتے ہیں کہ پاکستان 27ویں شب کو آزاد ہوا اور اس دن جمعۃ الوداع کا مبارک دن تھا تو پھر اس کی حقیقت کیا ہے؟ یومِ آزادی میں ایک دن کا فرق کیسے آ گیا؟ راقم الحروف نے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

بانی پاکستان قائداعظمؒ نے جب 15 اگست کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے قوم کو آزادی کی مبارکباد دی تھی آپ کے الفاظ یہ تھے: ’’آزاد اور خود مختار پاکستانی ریاست کا جنم دن 15 اگست ہے۔ آج جمعۃ الوداع ہے، رمضان کے مقدس ماہ کا آخری جمعہ، یہ ہم سب کے لئے خوشی کا دن ہے۔‘‘ اس دن کے ثبوت کے طور پر ہم اُس دور کے پاکستانی ڈاک ٹکٹ دیکھیں تو اُن پر آزادی کی تاریخ 15 اگست درج ہے۔ یہ ڈاک ٹکٹ آزادی کے 11 ماہ بعد 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوئے تھے۔ ان ڈاک ٹکٹوں پر واضح طور پر پاکستان کا یومِ آزادی 15 اگست 1947ء طبع ہوا ہے۔ گویا جس وقت یہ ڈاک ٹکٹ ڈیزائن ہوئے اور یہ اشاعت کے لئے برطانیہ بھیجے گئے تھے اُس وقت تک یہ بات طے تھی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا تو پھر ہم نے یومِ آزادی کی پہلی سالگرہ 15 اگست کی بجائے 14 اگست کیوں منائی؟ اور اب تک مناتے چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم دستاویز 1947ء کا انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ ہے جسے برطانوی پارلیمان نے منظور کیا جس کی توثیق شہنشاہ برطانیہ جارج ششم نے 18 جولائی 1947ء کو کی۔ یہ قانون 1983ء میں حکومت برطانیہ کی شائع کردہ دستاویز دی ٹرانسفر آف پاور کی جلد 12 صفحہ 234 پر اور اس کا اُردو ترجمہ قائداعظم پیپرز پروجیکٹ، کیبنیٹ ڈویژن اسلام آباد کے شائع کردہ جناح پیپرز کی جلد سوم صفحہ 45 تا 72 تک ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں واضح طور پر یہ تحریر درج ہے۔

15 اگست 1947ء سے برطانوی انڈیا میں دو آزاد فرماں روا مملکتیں قائم کی جائیں گی جو بالترتیب انڈیا اور پاکستان کے نام سے موسوم ہوں گی۔ بعد ازاں اس قانون میں ان مملکتوں سے مطلب نئی مملکتیں اور مقررہ دن سے مراد 15 اگست کی تاریخ ہو گی۔

مزید برآں اس قانون کے تسلسل میں جاری ہونے والے چند اور احکامات ملاحظہ ہوں جن کے اقتباسات اور ترجمہ ضیاء الدین لاہوری نے اپنے ایک مضمون ’’یومِ آزادی‘‘ جمعۃ المبارک 27 رمضان یا 15 اگست مشمولہ جریدہ 36 شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی میں شامل کیا ہے۔ 17 اگست 1947ء کو اقوام متحدہ میں برطانیہ کے مستقل نمائندے کا نام دفتر خارجہ کا تار۔ وائسرائے نے یہ تار بھیجا کہ مسلمان قائدین اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے درخواست دینے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ فوری طور پر پاکستان کی طرف سے درخواست دائر کرے اور جب پاکستان 15 اگست کو ایک آزاد مملکت بن جائے گا تو وہ اس کی توثیق براہِ راست خود کرے گا۔ (صفحہ 570)

12 اگست 1947ء انڈیا اور پاکستان کی رکنیت کے استحقاق پر سیکریٹریٹ اقوام متحدہ کے میمورنڈم کی پریس ریلیز سے ایک اقتباس۔ قانون آزادی ہند قرار دیتا ہے کہ اگست 1947ء کی 15 تاریخ کو انڈیا میں دو آزاد مملکتیں بالترتیب انڈیا اور پاکستان کے نام سے قائم ہوں گی۔ (صفحہ 685)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلانِ آزادی کے مطابق 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب رات 12 بجے دنیا کے نقشے پر ایک آزاد خود مختار اور دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مملکت کا اضافہ ہوا جس کا نام ’’پاکستان‘‘ تھا۔ عین اسی وقت پاکستان کے دیگر شہروں اور ڈھاکہ سے ریڈیو پاکستان سے آزادی کا اعلان ہوا اور ٹھیک رات 12 بجے لاکھوں سامعین کے کانوں میں انگریزی اور اُردو میں یہ آواز سنائی دی ’’یہ پاکستان براڈکاسٹنگ سروس ہے‘‘ اس کے بعد مولانا زاہد القاسمی نے قرآن مجید کی سورۃ فتح کی آیات تلاوت کیں۔ اس کے بعد علامہ اقبال کی نظم ’’ساقی نامہ‘‘ کے چند بند پیش کئے۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے انگریزی اور بنگلہ زبان میں اعلانات نشر ہوتے رہے۔ 15 اگست 1947ء کی صبح ریڈیو پاکستان سے ساڑھے آٹھ بجے بانی پاکستان کا ایک پیغام جو ریکارڈ شدہ تھا سنایا گیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے: ’’بے پایاں مسرت اور احساس کے

جذبات کے ساتھ میں آپ کو تہنیت کا پیغام دیتا ہوں۔ 15 اگست آزاد اور خود مختار پاکستان کی پیدائش کا دن ہے۔ یہ مسلم قوم کی منزل مقصود کی علامت ہے جس نے پچھلے چند برسوں میں اپنے وطن کے حصول کے لئے عظیم قربانیاں پیش کیں۔“

15 اگست کی صبح پاکستانی اخبارات نے یومِ آزادی کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع کئے اس میں انگریزی کا مشہور اخبار ڈان کراچی نے یہ سرخی لگائی ”پاکستان ہمیشہ ترقی کرے۔ (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) اس کا مکمل متن شائع کیا۔ ڈان کے خصوصی شمارہ میں قائداعظم کا ایک پیغام بھی شامل تھا جو یہ تھا۔

ترجمہ: مجھے بتایا گیا ہے کہ روزنامہ ڈان کا پہلا شمارہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی سے مقررہ دن 15 اگست کو شائع کیا جائے گا۔ اس دن پاکستان کا پہلا گزٹ بھی جاری ہوا۔ اس میں چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ عبدالرشید نے محمد علی جناح سے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور نوابزادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی کابینہ کے ارکان نے بھی اپنے عہدوں کا حلف اُٹھایا۔ ان تمام شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستان 14 اگست نہیں 15 اگست کو قیام عمل میں آیا۔

اس بات کی تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ 19 دسمبر 1947ء کو پاکستان کے محکمہ داخلہ نے اپنے ایک مراسلے 17/47 کے ذریعہ 1948ء کی جن سالانہ تعطیلات کا اعلان کیا ان میں 1948ء کے لئے یومِ پاکستان کی تعطیل کے آگے 15 اگست 1948ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ مراسلہ نیشنل ڈاکیو منٹیشن سنٹر اسلام آباد میں محفوظ ہے۔ ان فائلوں کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا 29 جون 1948ء کو کراچی میں وزیراعظم کے زیرصدارت کابینہ کا اجلاس ہوا اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے یومِ آزادی کی تقریبات 15 اگست 1948ء کے بجائے 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ اور معاملہ گورنر جنرل محمد علی جناح کے علم میں لائیں گے جو بعد میں حتمی فیصلہ جناح کی منظوری کے بعد ہوگا۔ یہ رائے اس فائل میں تفصیل کے ساتھ درج ہے جس کا نمبر CF/196/48 اور کیس نمبر 393/54/48 ہے یہ کارروائی انگریزی میں درج ہے۔ اس کارروائی کے آخر پر یہ تحریر درج ہے کہ ”قائداعظم نے یہ تجویز منظور کرلی ہے“

اس فائل میں اگلے حکم نامے کا نمبر 15/2/48 ہے جو 13 جولائی 1948ء کو جاری ہوا اور اس طرح اس حکم نامے کے مطابق ملک کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں گی۔ اس دن ملک بھر میں عام تعطیل ہوگی اور تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں پر قومی پرچم لہرائے جائیں گے۔

ان تمام معروضات اور دستاویزی شہادتوں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پاکستان 14 اگست کو نہیں 15 اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔ مذکورہ بالا پہلی کابینہ نے پاکستان کی تاریخِ آزادی تبدیل نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منائی جائیں گی۔ اس پر محمد علی جناح نے بھی اس فیصلے کی توثیق کی تھی۔ راقم الحروف کی اس تحقیق اور تحریر سے پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ میں سرکاری طور پر کوئی ابہام اور رفرق نہیں آئے گا مگر یہ حقیقت نہ جھٹلائی جاسکتی ہے اور نہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ہر ملک کو اختیار ہے کہ وہ جب مرضی ہو اپنا قومی دن منایا کرے لیکن اگر ملک کے وجود میں آنے کی بات ہے تو اس کی تاریخ بہرحال تبدیل نہیں کی جاسکتی اور وہ 15 اگست 1947ء ہی ہے۔ اس دن جمعۃ الوداع تھا اور اسلامی تاریخ 27 رمضان المبارک اسلامی تاریخ 1366 ہجری تھی اپنا یوم آزادی 15 اگست 1947ء کے بجائے 14 اگست 1947ء قرار دینے سے نہ صرف ہم اپنے یوم آزادی کی تاریخ بدلنے کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ جمعۃ الوداع اور 27 رمضان المبارک کے اعزاز سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔

❁❁❁

قیام پاکستان کے بعد پہلی نماز عید الاضحیٰ

یہ 25 اکتوبر 1947ء کی بات ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلی بار عید الاضحیٰ کا تہوار منایا جانا تھا۔ قائداعظم اور دیگر سرکاری عمائدین نے 18 اگست 1947ء کو عید الفطر کی نماز وفاقی دارالحکومت کراچی میں بندر روڈ پر مولوی مسافر خانہ کے نزدیک مسجد قصاباں میں ادا کی تھی جو عید گاہ کے نام سے بھی معروف تھی۔ اس نماز کی امامت کا فریضہ مشہور عالم دین مولانا ظہور الحسن درس نے انجام دیا تھا۔ 25 اکتوبر 1947ء کو عید الاضحیٰ کی نماز کی ادائی کے لیے بھی اسی مقام کا انتخاب ہوا۔ اس مرتبہ بھی امامت کا فریضہ مولانا ظہور الحسن درس کے حصے میں آنا تھا۔ قائداعظم کو نماز کے وقت سے مطلع کر دیا گیا۔ لیکن تمام لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب نماز کا وقت آ گیا مگر قائداعظم عید گاہ نہیں پہنچ پائے۔

اعلیٰ حکام نے مولانا ظہور الحسن درس کو مطلع کیا کہ قائداعظم راستے میں ہیں اور چند ہی لمحات میں عید گاہ پہنچنے والے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ نماز کی ادائگی کچھ وقت کے لیے موخر کر دیں۔ مولانا ظہور الحسن درس نے فرمایا ”میں قائداعظم کے لیے نماز پڑھانے نہیں آیا ہوں بلکہ خدائے عزوجل کی نماز پڑھانے آیا ہوں“ چناں چہ انہوں نے صفوں کو درست کر کے تکبیر فرما دی۔

ابھی نماز عید کی پہلی رکعت شروع ہوئی ہی تھی کہ اتنے میں قائداعظم بھی عید گاہ پہنچ گئے۔ نماز شروع ہو چکی تھی۔ قائداعظم کے منتظر اعلیٰ حکام نے قائد سے درخواست کی کہ وہ اگلی صف میں تشریف لے چلیں مگر قائداعظم نے ان کی درخواست مسترد کر دی اور کہا کہ میں پچھلی صف میں ہی نماز ادا کروں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قائداعظم نے پچھلی صفوں میں نماز ادا کی۔ قائداعظم کے برابر کھڑے نمازیوں کو بھی نماز کے بعد علم ہُوا کہ ان کے برابر میں نماز ادا کرنے والا ریاست کا کوئی عام شہری نہیں بلکہ ریاست کا سربراہ تھا۔ نماز کے بعد جب نمازیوں کے علم میں یہ بات آئی پوری عید گاہ قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ قائداعظم نمازیوں سے گلے ملنے کے بعد آگے تشریف لائے۔ انھوں نے مولانا ظہور الحسن درس کی جرأت ایمانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہمارے علما کو ایسے ہی کردار کا حامل چاہیئے۔

یہ درس بچوں کو مطالعہ پاکستان میں کیوں نہیں دیا جاتا؟

❁❁❁

قائداعظم اور مسلم لیگ کے کارکن ابوالحسن اصفہانی اور دیگر کی کہانی

اصفہانی خاندان کا تعلق کلکتہ سے تھا‘ یہ لوگ کلکتہ کے انتہائی متمول خاندانوں میں شمار ہوتے تھے‘ ابوالحسن کا تعلق اسی اصفہانی خاندان سے تھا‘ یہ کیمبرج میں پڑھتے تھے‘ وہاں قائداعظم کی تقریر سنی‘ قائداعظم کے عاشق ہوئے اور باقی زندگی قائداعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمت میں گزار دی۔

پاکستان بنا تو ابوالحسن اصفہانی کروڑوں روپے کے اثاثوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو گئے‘ ڈھاکا اور کراچی دونوں ان کے کاروباری مرکز تھے‘ ان دونوں شہروں میں ان کے کارخانے‘ کوٹھیاں‘ پلازے‘ فارم ہاؤسز اور زمینیں تھیں‘ امریکا میں سفیر کی تعیناتی کا مرحلہ آیا تو قائداعظم نے اصفہانی صاحب کو پہلا سفیر بنا کر امریکا بھجوا دیا‘ یہ وہاں پانچ سال سفیر رہے‘ پھر دو سال برطانیہ میں ہائی کمشنر رہے‘ پھر ایک سال صنعت اور تجارت کے وفاقی وزیر بنے۔

بھٹو صاحب کا دور آیا تو انھیں افغانستان میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا‘ یہ اصفہانی صاحب کا سفارتی اور سیاسی پروفائل تھا جب کہ دوسری طرف یہ معاشی اور تجارتی میدانوں میں بھی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے رہے‘ یہ صدر ایوب خان دور میں ان ۲۲ خاندانوں میں شامل تھے جو ملک کے زیادہ تر وسائل کے مالک تھے‘ اصفہانیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا‘ آپ پاکستان کے کسی حصے سے کوئی چیز خریدیں منافع کا ایک حصہ کسی نہ کسی ذریعے سے ہوتا ہوا اس اصفہانی گروپ تک پہنچ جائے گا۔

ابوالحسن اصفہانی کے تین بچے تھے‘ سکندر اصفہانی ان کے بڑے صاحبزادے تھے‘ اصفہانی صاحب سفارت اور سیاست میں مصروف رہتے تھے چنانچہ کاروبار کی ذمے داری سکندر اصفہانی کے کندھوں پر تھی‘ یہ خاندان ایوب خان اور بھٹو کے زمانے میں کھرب پتی ہو گیا‘ بھٹو صاحب نے صنعتیں قومیالیں لیکن اس کے باوجود اصفہانی خاندان کے پاس کراچی میں اربوں روپے کی پراپرٹی تھی‘ سکندر اصفہانی نے دو شادیاں کیں‘ پہلی اہلیہ سے چار بچے‘ دوسری اہلیہ بے اولاد تھیں۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ عدالتوں اور کچہریوں کا معاملہ چلا تو نوبت یہاں تک آ گئی وہ کراچی شہر جو کبھی اصفہانی خاندان کا گھر کہلاتا تھا اس شہر میں سکندر اصفہانی کے رہنے کے لیے کوئی چھت نہ بچی‘ سکندر اصفہانی سندھ کلب میں شفٹ ہو گئے‘ یہ دو سال کلب میں رہے اور دسمبر ۲۰۱۳ میں سندھ کلب میں انتقال کر گئے‘ کلب سے ان کا جنازہ اٹھا‘ جنازے میں چند لوگ شامل تھے اور ان لوگوں میں ان کے خاندان کا کوئی شخص شامل نہیں تھا‘ سکندر اصفہانی فرح ناز اصفہانی کے والد اور حسین حقانی کے سسر تھے۔

یہ دولت کی بے وفائی اور دنیا کی بے ثباتی کا ایک واقعہ ہے‘ آپ اب پاکستان کے پانچ بڑے صنعتی گروپوں میں شامل ایک دوسرے خاندان کی کہانی بھی ملاحظہ کیجیے‘ سہگل خاندان ایوب خان دور کے ۲۲ خاندانوں میں پہلے پانچ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا‘ یہ لوگ چکوال کے رہنے والے تھے‘ یہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کلکتہ گئے‘ وہاں چمڑے کا کاروبار شروع کیا اور اس کاروبار پر مناپلی قائم کر لی‘ یہ لوگ قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔

سہگل خاندان نے پچاس کی دہائی میں کوہ نور ٹیکسٹائل کے نام سے فیصل آباد اور راولپنڈی میں دو کارخانے لگائے‘ یہ کارخانے اتنے بڑے اور کامیاب تھے کہ آج بھی ان علاقوں کو کوہ نور کہا جاتا ہے‘ ایوب خان کا دور سہگل خاندان کے عروج کا زمانہ تھا‘ سہگلوں نے یونی ایل بنایا‘ یہ پاکستان کا تیسرا بڑا بینک تھا‘ یہ گھی کی صنعت میں آئے‘ ریان کپڑا شروع کیا‘ کیمیکل اور مشینری کے شعبے میں آئے اور عروج کو ہاتھوں میں تھام لیا‘ محمد یوسف سہگل اس خاندان کے سربراہ تھے‘ یہ 1993 میں فوت ہوئے‘ ان کا جنازہ جارہا تھا۔ قبرستان کے قریب پہنچ کر یوسف سہگل کے ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے پر وصیت میں ہیراپھیری کا الزام لگا دیا‘ دوسرے نے انکار کر دیا اور یوں والد کی تدفین سے قبل خاندان میں پھوٹ پڑ گئی‘ بچے دولت اور جائیداد کے لیے لڑنے لگے‘ آج اس خاندان کا صرف نام بچا ہے اور شاید اگلے دس بیس برسوں میں لوگ سہگل خاندان کا نام ہی بھول جائیں۔

آپ اب لاہور کے ایک فلم ساز کی کہانی بھی سنیے‘ آغا جی اے گل پاکستان کے چوٹی کے فلم ساز تھے‘ یہ پشاور کے رہنے والے تھے‘ یہ ۲۱ سال کی عمر میں فلمی لائین میں آئے‘ صوبہ سرحد میں فلموں کے ڈسٹری بیوٹر بنے‘ جگت ٹاکیز اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی فلم کمپنی تھی‘ آغا گل اس کمپنی کی فلمیں ریلیز کرنے لگے‘ ایک وقت آیا جب آغا گل جگت ٹاکیز کی تمام فلمیں ریلیز کرنے لگے‘ آغا گل نے صوبہ سرحد میں ذاتی سینما بنا لیے‘ یہ قیام پاکستان کے بعد لاہور شفٹ ہوئے۔

انھوں نے ۱۹۵۰ میں ’’مندری‘‘ فلم بنائی‘ فلم کامیاب ہو گئی تو انھوں نے ایورنیو پکچرز

کے نام سے فلمی کمپنی بنائی‘ یہ بعدازاں پاکستان کے سب سے بڑے اسٹوڈیو ”ایورنیو“ میں تبدیل ہوگئی‘ ملک کے درجنوں سپراسٹارز نے اس اسٹوڈیو میں آنکھ کھولی‘ آغا گل لاہور کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہونے لگے‘ گلبرگ مین بلیووارڈ پر ان کی آٹھ کنال کی کوٹھی تھی‘ یہ ۱۹۷۴ میں بیمار ہوئے اور گھر تک محدود ہو کر رہ گئے‘ نعیم بخاری صاحب نے ان دنوں نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی‘ یہ آغا گل کے صاحبزادے رفیق گل کے وکیل تھے۔

رفیق گل نے ایک دن نعیم بخاری کو ساتھ لیا اور آغا گل کے گھر پہنچ گیا‘ اداکار محمد علی بھی وہاں موجود تھے‘ بیٹے نے باپ سے جائیداد کا مطالبہ کر دیا‘ رفیق گل والد سے ۸ کنال کی کوٹھی لینا چاہتا تھا‘ باپ نے بیٹے کی منت کی ”میں بیمار ہوں‘ میں اس حالت میں کہاں جاؤں گا‘ میں آپ کو یہ کوٹھی لکھ دیتا ہوں‘ میرے مرنے کے بعد کوٹھی کا قبضہ لے لینا“ بیٹے نے انکار کر دیا‘ رفیق گل کا کہنا تھا ”اباجی آپ کو یہ گھر ابھی خالی کرنا ہوگا“ آغا گل کے حال پر محمد علی اور نعیم بخاری دونوں کو ترس آ گیا۔

محمد علی نے رفیق گل کو پیش کش کی‘ زیبا بیگم کے پاس ڈیڑھ کروڑ کے زیورات ہیں‘ آپ یہ زیورات اپنے پاس رکھ لیں لیکن آغا صاحب کو اس گھر میں رہنے دیں‘ آپ کو جب یہ گھر مل جائے گا تو آپ میرے زیورات مجھے واپس کر دینا مگر صاحبزادہ نہ مانا‘ یہ معاملہ طول پکڑ گیا تو صاحبزادے نے بریف کیس سے پستول نکال لیا اور والد پر تان دیا‘ آغا گل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے‘ وہ اٹھ کر اندر گئے‘ چیک بک لے کر آئے‘ ساٹھ ستر لاکھ روپے کا چیک کاٹا‘ یہ چیک رفیق گل کے حوالے کیا اور بولے ”آپ یہ رقم لو اور مجھے اس کے بعد کبھی اپنی شکل نہ دکھانا‘ رفیق گل نے وہ چیک جیب میں ڈالا اور نعیم بخاری کے ساتھ واپس چلا گیا۔

آغا جی اے گل ۱۹۸۳ میں انتقال کر گئے‘ انتقال کے وقت ان کا کوئی اپنا وہاں موجود نہیں تھا‘ آج دنیا میں گل فیملی بچی ہے‘ ایورنیو اسٹوڈیو اور نہ ہی آٹھ کنال کی وہ کوٹھی جس کے لیے بیٹے نے باپ پر پستول تان لی تھی‘ نعیم بخاری صاحب کے بقول ”یہ منظر دیکھنے کے بعد میرے دل میں پوری زندگی کے لیے دولت کی خواہش ختم ہوگئی“۔

یہ صرف تین واقعات ہیں‘ آپ اگر چند لمحوں کیلئے آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھیں تو آپ کو اپنے اردگرد سیکڑوں ایسی مثالیں ملیں گی‘ ہم سے زندگی میں صرف دس چیزیں بے وفائی کرتی ہیں‘ ہم اگر ان دس بیوفاؤں کی فہرست بنائیں تو عہدہ‘ دولت اور اولاد پہلے تین نمبروں پر آئے گی‘ میں نے زندگی میں بیشمار لوگوں کو عہدے کے لیے دوسروں کے کتوں کو نہلاتے اور اپنی پگڑی سے صاحب کی گاڑی کا شیشہ صاف کرتے دیکھا لیکن عہدہ اس کے باوجود ان کے نیچے سے نکل گیا۔

میں نے کرسی پر بیٹھے لوگوں کو فرعون اور نمرود بنتے بھی دیکھا اور ”نسلیں ختم کر دو“ جیسے احکامات جاری کرتے بھی لیکن پھر جب عہدے نے بیوفائی کی تو میں نے اپنی آنکھوں سے محترمہ بینظیر بھٹو اور میاں نواز شریف جیسے بااختیار لوگوں کو بھی عدالتوں کے باہر گندی اینٹوں اور قلعوں کی حبس زدہ کوٹھڑیوں میں محبوس دیکھا۔ میں نے بیشمار ارب اور کھرب پتی لوگوں کو پیسے پیسے کا محتاج ہوتے بھی دیکھا۔

میں روز اسلام آباد شہر میں نکلتا اور ساتھ ساتھ سوچتا ہوں آج جہاں مارکیٹیں‘ گراؤنڈز اور سڑکیں بنی ہیں وہاں آج سے چالیس سال قبل گاؤں ہوتے ہونگے اور ان گاؤں کے چوہدری بھی ہوتے تھے اور ان چوہدریوں کی انا بھی بانس کے آخری سرے کو چھوتی ہوگی لیکن آج وہ چوہدری‘ ان کی زمینیں اور ان کے گاؤں کہاں ہیں؟ شاید سپر مارکیٹ کے نیچے دفن ہوں یا پھر مارگلہ روڈ کی گولائیوں میں گم ہوں اور یہ صرف چالیس سال پرانا قصہ ہے۔ چار دہائیوں میں زمین کی شکل ہی تبدیل ہوگئی چنانچہ پھر دولت سے بڑی بے وفا چیز کیا ہوگی اور رہ گئی اولاد! میں نے بیشمار لوگوں کو اپنی اولاد سے محبت کرتے دیکھا‘ یہ لوگ پوری زندگی اپنی اولاد کے سکھ کے لیے دکھوں کے بیلنے سے گزرتے رہے لیکن پھر کیا ہوا؟ وہ اولاد زمین جائیداد کے لیے اپنے والدین کے انتقال کا انتظار کرنے لگی‘ میں نے اپنے منہ سے بچوں کو یہ کہتے سنا ”اباجی بہت بیمار ہیں‘ دعا کریں اللہ تعالیٰ ان کی مشکل آسان کردے“ اور یہ وہ باپ تھا جو بچوں کے نوالوں کے لیے اپنا ضمیر تک بیچ آتا تھا‘ میں نے ایسے مناظر بھی دیکھے‘ باباجی کے سارے بچے ملک سے باہر چلے گئے۔ باباجی نے تنہائی کی چادر بُن بُن کر زندگی کے آخری دن گزارے۔

انتقال ہوا تو بچوں کو وقت پر سیٹ نہ مل سکی چنانچہ تدفین کی ذمے داری ایدھی فاؤنڈیشن نے نبھائی یا پھر محلے داروں نے! یہ ہے کُل زندگی! اولاد‘ دولت اور عہدے کی بیوفائی‘ ان بیوفائیوں کے داغ اور آخر میں قبر کا اندھیرا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس کے باوجود انسان کا کمال ہے‘ یہ دیکھتا ہے لیکن اسے نظر نہیں آتا‘ یہ سنتا ہے لیکن اسے سنائی نہیں دیتا اور یہ سمجھتا ہے لیکن اسے سمجھایا نہیں جاسکتا‘ یہ ہر روز لوگوں کو تباہ ہوتا مرتا‘ ذلیل ہوتا دیکھتا ہے مگر یہ ہر بار خود کو یقین دلاتا ہے ”یہ میرے ساتھ نہیں ہوگا“ کیوں؟ کیوں کہ ”میں دوسروں سے مختلف ہوں“۔ (منقول)

❁❁❁

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

پاکستان جب صنعتی اور زرعی لحاظ سے خود کفیل تھا

تحریر: ابنِ درویش

ہمارے وزیرِاعظم جناب عمران خان صاحب اپنی ''یوروگرین کارڈ'' سکیم کی افتتاحی تقریب میں خطاب فرمارہے تھے اور پاکستان کے اس زمانے کو جس میں پاکستان بہت ترقی کر رہا تھا سراہتے ہوئے بتا رہے تھے کہ اس زمانے میں پاکستان کی معیشت بہت اچھی تھی۔ صنعتی لحاظ سے پاکستان ترقی کر رہا تھا۔ زرعی لحاظ سے خود کفیل تھا اور یہ کہ جب میں ہندوستان کے ساتھ کرکٹ کھیل کر واپس آتا تھا تو یہ لگتا تھا کہ میں کسی غریب ملک سے امیر ملک میں واپس آیا ہوں۔ اس موضوع پر بولتے ہوئے بالعموم سابق صدر ایوب کا نام لیا کرتے تھے لیکن مذکورہ خطاب میں یہ ذکر نہیں تاہم اس زمانے کی ترقی کے متعلق انہوں نے کہا کہ ہم آج وہ کام کرنے جارہے ہیں جو آج سے پچاس سال پہلے ہونا چاہئے تھا۔ مگر اس زمانے میں پلیننگ (منصوبہ بندی) ہوتی تھی سوچ سمجھ کر دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسے منصوبے بنائے جاتے تھے جو آئندہ نسلوں کے لئے بھی مفید ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم اور معاشی ترقی کا ذکر کیا۔

وزیرِاعظم صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں پانچ سالہ منصوبوں کا بغور مطالعہ کیا ہوگا۔ ان کی خوبیاں اور فوائد بھی ذہن میں آئے ہوں گے۔ ان منصوبوں کے بنانے والوں کا بھی پتہ چلا ہوگا لیکن کسی مصلحت سے آپ نے اس زمانے کے چیئرمین منصوبہ بندی کمیشن کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے عام طریق اور دستور کے مطابق غالباً یہ ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ کامیاب منصوبہ بندی کے چیئرمین میاں ایم ایم احمد تھے جو ایک معروف اور ممتاز احمدی تھے۔

ہم قائدِاعظم محمد علی جناح کے بلند کردار اور تدبر و فراست کا اکثر ذکر کرتے ہیں اس جگہ ان کا نام اس لئے یاد آیا کہ قائدِاعظم کو اس زمانے میں جب پاکستان ایک نوزائیدہ مملکت کے طور پر منصہ شہود (منظرِعام) پر آیا تھا کسی ایسے قابلِ اعتماد محنتی اور مخلص ساتھی کی ضرورت تھی جو دنیا میں پاکستان کو بہتر رنگ میں روشناس کرا سکے۔ ان کی نظرِانتخاب چوہدری محمد ظفراللہ خان پر پڑی اور وہ اپنے خداداد تدبر و فراست سے یہ سمجھ گئے کہ پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے لئے یہ شخص بہت موزوں رہے گا۔ پاکستان کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی مسئلہ کشمیر شروع ہوگیا۔ یاد رہے کہ اس مسئلہ کو اقوامِ متحدہ میں حل کروانے کے لئے ہندوستان اس معاملہ کو وہاں لے گیا اور ان کو یہ یقین تھا کہ ہمارا یہ کیس اتنا مضبوط ہے کہ یقیناً ہمارے حق میں فیصلہ ہوگا۔ مگر یہ بات بہت ہی دلچسپ ہے کہ جب اس مسئلہ پر اقوامِ متحدہ میں بحث شروع ہوئی تو چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب نے ایسی مفصّل، مدلّل فاضلانہ بحث کی کہ ہندوستان کو بات آگے چلانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور وہ یہ بہانہ بتا کر وہاں سے واپس ہندوستان چلے گئے کہ ہم اپنے وزیرِاعظم سے مشورہ کرنے جارہے ہیں۔ اس صورت حال کو اعتدال پر لانے کے لئے وزیرِاعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو کو متعدد بار کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی ان قرار دادوں کے مطابق یہ اعلان کرانا پڑا کہ کشمیر کا فیصلہ استصواب رائے سے ہی حل ہوگا۔ ان کا یہ شہرہ آفاق جھوٹ دنیا بھر میں بدنام ''یوٹرن۔ U TURN''۔ ہمارے وزیرِاعظم جو یوٹرن لینے میں اچھی مہارت رکھتے ہیں اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر ''یوٹرن'' لیا کرتے تھے۔ (غالباً وہ پنڈت جی کے یوٹرن سے ہی یہ 'سنہری' اصول سمجھے ہوں۔ ویسے عوام بے چارے تو یوٹرن اور جھوٹ میں کم ہی کوئی فرق سمجھتے ہیں) ذکر یہ ہو رہا ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیرِخارجہ کو دنیا میں پاکستان کا نام بلند کرنے کے ساتھ ساتھ متعدد اسلامی ممالک کی آزادی کے سلسلہ میں کامیاب جدوجہد کی توفیق ملی۔ مسئلہ فلسطین پر آپ کی نہایت معقول اور مدلّل تقاریر آج بھی اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ تقسیم برصغیر کے وقت پنجاب بونڈری کمیشن کے سامنے قائدِاعظم کے ارشاد کی تعمیل میں آپ نے مسلم لیگ کا کیس اس عمدگی سے پیش کیا کہ قائدِاعظم نے انہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا۔

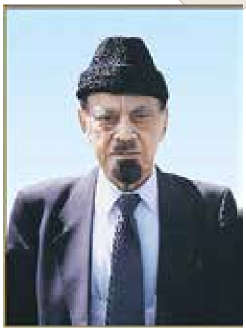

ہمارے وزیرِاعظم جس طرح ایم ایم احمد کا نام نہیں لے سکے اسی طرح پاکستان کے پہلے وزیرِخارجہ کا نام بھی نہیں لے سکیں گے۔ حالانکہ قائدِاعظم کو اپنے ان مخلص، قابلِ اعتماد ساتھیوں سے اتنا فائدہ ہوا کہ اس زمانے کی یاد جناب وزیرِاعظم عمران خان صاحب بھی بھُلا نہیں سکے۔ ہاں یہ ''احتیاط'' ضرور کرتے ہیں کہ کشمیر کی قرار دادوں کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے نمائندے کا نام نہیں لیتے۔ مشہور ہے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ پہلے خلفاء کرام کے زمانے میں بہت ترقی ہو رہی تھی مگر آج کل اُس طرح ترقی نہیں ہو رہی تو حضرت علیؓ نے جواباً فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مشیر و مددگار میرے جیسے تھے جبکہ میرے مشیر اور مددگار تمہارے جیسے ہیں۔ محترم وزیرِاعظم صاحب بھی اپنی مجالس میں اپنی کامیابیوں کے سلسلہ میں زلفی بخاری، فیصل واوڈا، مولانا طاہر اشرفی اور دوسرے ایسے ساتھیوں کا نام لے سکتے ہیں۔!!!!! اللہ تعالیٰ پاکستان پر رحم فرماوے اور ایسے لیڈر عطا فرماوے جو ذاتی مفادات سے آگے بڑھ کر پاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کی بہتری کے لئے کام کرنے والے ہوں۔ ❁❁❁

عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہئے

تحریر: عطاء الحق قاسمی

پاکستان کے سابق چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی آپ بیتی پڑھنے کے بعد ایک بات کی داد دینا پڑتی ہے اور وہ ہے ان کی صاف گوئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ چھپایا نہیں۔ سادہ سی زبان میں اپنی زندگی کی کہانی بیان کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو شخص پاکستان کے اہم ترین عدالتی عہدے پر براجمان رہا اسے اپنے ماضی میں غربت میں گزارے ایام پر کوئی شرمندگی نہیں، یہ ان کیلئے باعث فخر ہیں بلکہ ان واقعات پر ہم سب کو فخر ہونا چاہئے کہ کیسے ایک ایسا شخص جو بچپن میں ہی یتیم ہو گیا، جس کے پاس سرکاری اسکول کی فیس جمع کروانے کے بھی پیسے نہ تھے اور جو معمولی نوکریاں کر کے اپنا خرچ چلاتا تھا، اپنی محنت اور یقین کامل سے کامیابی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ میں اکثر یہ بات کہتا ہوں کہ ہمیں یہ ماننے میں عار کیوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے باپ دادا میں سے کوئی موچی تھا اور کوئی کمہار یا نائی۔ ہم محنت کشوں کی اولاد ہیں۔ انگریزوں کے کتے نہلانے والوں کی طرح ''خاندانی'' نہیں۔ ہماری میراث علم ہے، وہ تربیت ہے جو ہمارے والدین نے کی اور ہمارا اثاثہ اس دھرتی کی محبت ہے جس نے ہماری آبیاری کی اور ہمیں زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کئے۔ ارشاد صاحب ایامِ تنگدستی میں بھی کبھی شاکی نہیں رہے۔ ان کی پُراعتمادی ان کو زندگی میں آگے بڑھنے میں مدد دیتی رہی۔ ایک جگہ ارشاد صاحب نے ذکر کیا ہے کہ ان کے ہونے والے سسرال میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ارشاد صاحب کوتاہ قامت ہیں حالانکہ ان کا قد اپنی بیگم کے برابر تھا۔ اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے ارشاد صاحب نے خصوصی جوتوں کا آرڈر دیا جو ایک انچ بلند تھے اور اس طرح ان کے سسرالی رشتہ داروں کا وہم جاتا رہا اور انہیں لگنے لگا کہ ارشاد صاحب کا قد تھوڑا لمبا ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب بھی ان کے جوتے کی طرح ہے جس کے ذریعے ارشاد صاحب اپنے طویل القامت ہونے کا تاثر دیتے تھے۔ بطور چیف جسٹس ان پر الزام ہے کہ انہوں نے پرویز مشرف کے اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھایا جبکہ سینئر ترین جج اور چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی سمیت دیگر بہت سے ججوں نے انکار کر دیا تھا۔ ارشاد صاحب کے بقول وہ اگر ایسا نہ کرتے تو ملک میں فوجی عدالتیں قائم ہو جاتیں اور مشرف ابھی تک اقتدار میں ہوتا۔ پہلی بات تو یہ کہ فوجی عدالتیں قائم ہونا پی سی او کے تحت حلف نہ لینے سے مشروط نہیں، ضیاء الحق کے دور میں فوجی عدالتیں اس لئے قائم نہیں ہوئی تھیں کہ ججوں کے عدم تعاون کی وجہ سے عدالتیں بند ہو گئی تھیں بلکہ اس لئے کہ ضیاء الحق اپنی آمرانہ طاقت کو پوری طرح نافذ کرنا چاہتا تھا۔ پرویز مشرف کو ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ارشاد حسن خان سمیت سپریم کورٹ کے بارہ ججوں نے پرویز مشرف کے اقدام کو آئینی جواز فراہم کیا۔

ایک فوجی آمر کو آئین میں ترمیم کا حق دینے کے حوالے سے ارشاد صاحب کا کہنا ہے کہ یہ حق انہوں نے نہیں دیا یہ تو پرویز مشرف کی طرف سے جاری کردہ عبوری حکمنامے میں پہلے سے درج تھا۔ ارشاد صاحب بار بار اس بات کو دہراتے ہیں کہ انہوں نے خالد انور اور دیگر وکلا سے یہ سوال پوچھا کہ آپ بتائیں کیا کرنا چاہئے۔ بقول ان کے خالد انور بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے واپس موڑنا ناممکن ہے لہٰذا اپنے تئیں ارشاد صاحب نے وہی کیا جو کرنا عملی طور پر ممکن تھا۔ میرے، خیال میں ارشاد صاحب دو کام کر سکتے تھے ایک تو یہ کہ وہ بعین ویسا کرتے جیسے سعید الزمان صدیقی صاحب نے کیا اور خاموشی سے ریٹائر ہو جاتے۔ انکار کی جرأت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ہماری روایت میں امام ابو حنیفہؒ نے تو قاضی القضاۃ کا عہدہ یہ کہہ کر قبول نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے اہل نہیں! اور اس بات پر انہیں عباسی خلیفہ کے ہاتھوں صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو غاصب سے بیعت لے وہ بھی تاریخ میں اسی منصب کا حق دار ٹھہرے جو عزت بیعت سے انکار کرنے والے کے نصیب میں آتی ہے۔ تاریخ میں زندہ رہنے کے لئے موت سے پہلے مرنا پڑتا ہے تا کہ انسان ہمیشہ جی سکے۔ آپ بیتی کے ذریعے تاریخ سازی کر کے آپ تاریخ سے این آر او لے سکتے۔

دوسرا کام جو ارشاد صاحب کر سکتے تھے وہ یہ کہ اسی یقین محکم سے کام لیتے جس کا مظاہرہ انہوں نے قلفی کھانے کے ضمن میں کیا تھا، خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھتے، شاید کوئی دس آنے کا سکہ انہیں سپریم کورٹ کی دہلیز پر گرا ہوا مل ہی جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر نہ جعلی ریفرنڈم ہوتا، نہ منتخب وزیر اعظم کو ہائی جیکر کہہ کر ملک بدر کیا جاتا، نہ آئینی صدر کو یک جنبش قلم ہٹایا جا سکتا اور نہ ہی پرویز رشید اور صدیق الفاروق جیسے سیاسی کارکنوں کو جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کی پاداش میں زنداں میں ڈالا جاتا، لیکن یہ سب نہیں ہوا، لہٰذا اب وہ سب بھی نہیں ہو سکتا جس کی توقع ارشاد صاحب اس کتاب سے کر رہے ہیں۔ اس کاوش سے ارشاد صاحب کا قد بلند نہیں ہوا بلکہ تھوڑا اور کم ہو گیا ہے!

آخر میں میرے تین اشعار پیش ہیں:

خوشبوؤں کا اک نگر آباد ہونا چاہئے	اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہئے
ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں	عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہئے
عرض کرتے عمر گزری ہے عطاؔ صاحب جہاں	آج اس محفل میں کچھ ''ارشاد'' ہونا چاہئے

شعبہ پاکستان

مفتی عزیز الرحمان تنہا قصوروار نہیں ہے!

تحریر: سید مجاہد علی

نوجوان طالب علم کو جنسی استحصال کا نشانہ بنانے والے لاہور کے مفتی عزیز الرحمان کو میانوالی سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ملزم مقدمہ درج ہونے کے بعد گرفتاری سے بچنے کے لئے مفرور تھا۔ گزشتہ روز ہی لاہور پولیس نے بتایا تھا کہ متعدد جگہ چھاپہ مارنے کے باوجود ملزم گرفتار نہیں ہوا۔ تاہم آج سی آئی اے نے عزیز الرحمان کو میانوالی کی ایک مسجد سے گرفتار کرلیا۔ اسے لاہور لا کر تفتیش اور قانونی کارروائی کا آغاز کیا جائے گا۔ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب انعام غنی نے ایک ٹویٹ میں اس معاملہ کو ٹیسٹ کیس بنانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'ہم اس معاملے کی سائنٹیفک پیشہ وارانہ تحقیقات کریں گے اور ملزم کے خلاف مقدمہ قائم کرکے عدالت سے اسے سزا دلوائیں گے۔ ہم اپنے بچوں کو ایسے جنسی درندوں سے بچانا چاہتے ہیں اور مستقبل میں معاشرے کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں'۔ ملک کے سب سے بڑے صوبے کے پولیس سربراہ کا یہ بیان اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ اس میں بچوں کے خلاف جنسی جرائم کو سنجیدگی سے لینے اور ایسے جرائم میں ملوث ہونے والے افراد کو ان کے سماجی رتبہ سے قطع نظر قانون کے مطابق سزا دلوانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی آئی جی پولیس کے بیان کے حوالے سے یہ بات بھی نوٹ کی جاسکتی ہے کہ پولیس نے اس کارروائی کا آغاز سوشل میڈیا پر یکے بعد دیگرے متعدد ویڈیو عام ہونے اور ملزم کی طرف سے 'وضاحتی ویڈیو' جاری ہونے کے کئی روز بعد کیا گیا تھا۔ جرم پتہ لگتے ہی پولیس فوری طور سے ایکشن میں نہیں آئی تھی۔ اسی طرح انعام غنی کے ٹویٹ کے اس پہلو سے بھی مکمل اتفاق ممکن نہیں کہ کسی ایک معاملہ میں ملوث ایک شخص کو سزا دلوانے سے اس قوم کے بچے محفوظ ہوجائیں گے یا معاشرہ کی تطہیر کا فرض پورا کرلیا جائے گا۔ یہ گرفتاری اور پولیس کا عزم بلاشبہ درست سمت میں ایک مناسب قدم ہے لیکن اس حوالے سے سماجی رویوں میں تبدیلی او رمعاشرہ کی ہر سطح پر احساس ذمہ داری اجاگر کرنا بھی بے حد ضروری ہوگا۔ یہ سمجھ لینا فاش غلطی ہوگی کہ اتفاقاً ایک واقعہ کو سوشل میڈیا پر شہرت ملنے کے بعد ہونے والی کارروائی سے معاشرہ سے بچوں کے خلاف جنسی جرائم کا خاتمہ ہوجائے گا۔

اس حوالے سے ایک طرف پولیس نظام کو فعال، موثر اور مستعد کرنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف جنسی جرائم کے بارے میں عمومی رویہ کو تبدیل کرنا بھی اہم ہوگا۔ کوئی ایک واقعہ ضرور کسی جرم کے بارے میں آگاہی کے حوالے سے سبق آموز ہوسکتا ہے لیکن ایک شخص کو سزا دلوانے یا اس واقعہ کو سماجی تنہائی میں رونما ہونے والا اکا دکا سانحہ سمجھ لینا بھی اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا ایسے معاملات میں بوجوہ درگزر کرنے یا چشم پوشی کے طرز عمل سے ہوتا ہے۔ ایسے جرائم پروان چڑھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گھر ہو، مدارس ہوں یا اسکول یا سماج میں بچوں اور بالغوں کے درمیان میل جول کے دوسرے ادارے و مواقع، وہاں بوجوہ سائے میں ابھرنے والی ایک مخصوص ثقافت کے بارے میں نہ تو بات کی جاتی ہے، نہ اس بارے میں شعور پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی نحیف آواز شکایت کرنے کی کوشش بھی کرے تو ظلم کا شکار ہونے والے کو ہی درگزر سے کام لینے کا مشورہ دے کر خاموش کروانے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح ایک افسوسناک سماجی مسئلہ پر بات کرنے، سبق سیکھنے، اصلاح کا پہلو تلاش کرنے اور ایک تکلیف دہ علت کے خاتمہ کی تحریک منظم کرنے کی بجائے، اس گھناؤنی اور مجرمانہ ثقافت کی آبیاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے اگر زیر غور مفتی عزیز الرحمان کیس کو ہی دیکھا جائے تو شکایت کنندہ کو اسی وقت ہمدردی حاصل ہوسکی تھی جب اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی ویڈیو ایک یوٹیوب چینل کے ذریعے عام کرنے کا حوصلہ کیا۔ یہ قیاس کرنا بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک مدرس کے ہاتھوں جنسی زیادتی کا نشانہ بننے والے نوجوان کے لئے یہ فیصلہ کرنا اور خود اپنے آپ کو دنیا کے سامنے اس تکلیف دہ صورت میں پیش کرنا کس قدر مشکل اور کربناک ہوگا۔ اس سے یہ سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے معاشرہ یا اس کے ادارے جنسی زیادتی کا نشانہ بننے والے نوجوان کی بات پر اس وقت تک اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جب تک وہ اس کا 'دستاویزی ثبوت' سامنے نہیں لایا بلکہ اسے سوشل میڈیا پر نشر کرکے خود ہی اپنی سماجی اہانت کا اہتمام کرنے پر مجبور ہوا۔ آئی جی پنجاب ضرور اب اس واقعہ میں ملوث شخص کو نشان عبرت بنانے کی بات کررہے ہیں لیکن ان کے زیر انتظام پولیس بھی سوشل میڈیا پر ویڈیو نشر ہونے کے بعد پیدا ہونے والے دباؤ اور عوامی غم وغصہ ہی کی وجہ سے متحرک ہوئی تھی۔ ملک اور پنجاب میں پولیس کلچر اس قابل نہیں ہے کہ یہ نوجوان سوشل میڈیا سے مدد لینے کی بجائے براہ راست پولیس افسر کے پاس جاتا اور اس کی شکایت پر اس جرم میں ملوث شخص کے خلاف کارروائی کی جاتی۔ عزیز الرحمان کی گرفتاری اور اس کے خلاف مقدمہ ایک ہفتے سے زائد مدت تک یہ معاملہ سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز پر زیر بحث رہنے کے بعد ہی ممکن ہوسکا تھا۔ انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب اگر مستقبل میں واقعی معاشرہ کو محفوظ اور اپنے کم سن بچوں کو سماجی لحاظ سے طاقت ور کرداروں کے مجرمانہ افعال سے محفوظ کرنے کی کوئی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے محکمہ میں اس شعور کو عام کرنا ہوگا کہ جنسی جرائم کا شکار ہونے والے شکایت کنندہ کو احترام دینے اور ان کی بات پر اعتبار

کرنے کا رویہ فروغ پائے۔ابھی چند روز پہلے ہی قصور میں ایک پولیس افسر نے اپنی کم سن بچی کے ساتھ جنسی زیادتی کی شکایت کے لئے آنے والے ایک باپ کو تھانے کی صفائی کا حکم دے کر اس مزاج کی نشاندہی کی تھی جس کی وجہ نہ تو ایسے جرائم منظر عام پر آتے ہیں اور نہ ہی ظلم کا شکار ہونے والے پولیس کے پاس شکایت کرنے کا حوصلہ کرتے ہیں۔ تاہم اس حوالے سے ساری ذمہ داری صرف پولیس کے کاندھوں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ سماج سدھار کے لئے قائم ایک اہم محکمہ ہونے کے باوجود پولیس بھی اس معاشرے کا ہی کا حصہ ہے جہاں جنسی جرائم کو سماجی تلذذ کے لئے تو استعمال کیا جاتا ہے لیکن ان کی بیخ کنی کے لئے کوئی ٹھوس، عملی، سماجی، علمی، سیاسی یا دینی تحریک دیکھنے میں نہیں آتی۔ زیر بحث معاملہ کا یہی پہلو تکلیف دہ اور قابل توجہ ہے۔ اصل تفصیلات تو پولیس تفتیش کے بعد ہی سامنے آسکتی ہیں کہ یہ معاملہ کب سے متعلقہ افراد کے علم میں تھا لیکن کوئی ٹھوس اقدام کرنے کی بجائے شکایت کنندہ کو ہی ہراساں کرنے یا سمجھانے بجھانے کی کوشش کی گئی۔ ان عناصر میں متعلقہ مدرسہ کی انتظامیہ سے لے کر وفاق المدارس کے وہ عہدیدار سبھی شامل ہیں جنہوں نے معلومات سامنے آنے اور شکایت سننے کے فوری بعد اس گھناؤنے فعل میں ملوث شخص کو تحفظ فراہم کیا۔ جب معاملہ مزید کھلا تو اس پر اکتفا کیا گیا کہ مفتی صاحب کو نوکری سے نکال کر مدرسے کا مکان خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ ایک بچے کے خلاف جنسی دست درازی کرنے والے کسی استاد کو فوری طور سے پولیس کے حوالے کرنے اور اس کے جرم کا نشانہ بننے والے دیگر طالب علموں کی حفاظت کے لئے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اصول قانون کے تحت صرف جرم کرنے والا ہی قصوروار نہیں ہوتا بلکہ اس کی پردہ پوشی کرنے والے کو بھی شریک جرم ہی سمجھا جائے گا۔ مفتی عزیز الرحمان کے معاملہ میں تفتیش کے دوران پولیس کو اس پہلو پر غور کرتے ہوئے ان تمام افراد کے خلاف بھی کارروائی کرنی چاہیے جو مختلف مراحل پر اس جرم سے آگاہ تھے لیکن اس کے بارے میں پولیس کو شکایت کرنے اور معلومات فراہم کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ متعلقہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے ان تمام طالب علموں سے بھی استفسار کرنے کی ضرورت ہے جو عزیز الرحمان سے تعلیم پاتے رہے تھے۔ جنسی جرم کے عادی شخص کے ہاتھ کسی بھی معصوم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کیا صرف ایک نوجوان ہی عزیز الرحمان کی زیادتی کا نشانہ بنا تھا یا کچھ دوسرے بچوں کو بھی ایسی ہی شکایت ہے۔ ان دو پہلوؤں پر کام کرنے سے ہی مستقبل میں جنسی ہوس میں ملوث افراد کو کسی ناجائز حرکت سے روکنے کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ مدرسہ کی انتظامیہ اور دیگر افراد کی لاتعلقی کے علاوہ اس معاملہ میں ملک کے دینی رہنماؤں کی خاموشی اور بے اعتنائی بھی تکلیف دہ امر ہے۔ خاص طور سے اس حقیقت کی روشنی میں کہ ملزم عزیز الرحمان سیاسی طور سے بھی متحرک تھا اور جمعیت علمائے اسلام (ف) کا عہدے دار بھی رہا ہے۔ معاملہ کھلنے پر اگرچہ جمعیت علمائے اسلام (ف) لاہور کے سیکرٹری جنرل نے ضرور عزیز الرحمان کی پارٹی رکنیت معطل کرنے کا اعلان کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ 'تحقیقات مکمل ہونے تک رکنیت معطل رہے گی' اسے معاف کرنے کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ بلکہ بیان سے یہی تاثر ملتا ہے جیسے عزیز الرحمان کی بے گناہی کا ثبوت بھی سامنے آسکتا ہے۔ یہ کہنے میں مضائقہ نہیں ہے کہ جرم ثابت ہونے تک کسی کو قصوروار قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن ملک میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی داعی جے یو آئی کو اس معاملہ کے سیاسی اور سماجی پہلو کا بھی اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ جماعت کی اعلیٰ ترین قیادت کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ خبر سامنے آنے کے بعد فوری طور سے اس معاملہ سے لاتعلق ہونے کا اعلان کرتے اور اپنے عہدے دار کو حکم دیا جاتا کہ وہ پولیس و عدالت کے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کریں نہ کہ ایک ناقص ویڈیو بیان کو شافی مان کر معاملہ رفع دفع کیا جاتا۔ اسی طرح درسگاہوں میں جنسی زیادتی چونکہ ایک سنگین مسئلہ ہے، اس لئے ایک ٹھوس واقعہ سامنے آنے کے بعد قومی منظر نامہ پر متحرک اور فعال علمائے کرام کا اخلاقی و دینی فرض تھا کہ وہ اس ذہنیت اور جرم کے خلاف آواز بلند کرتے۔ تاہم چند بیانات کے علاوہ اہم دینی لیڈروں اور جماعتوں نے جس طرح خاموشی اختیار کی ہے، وہ ان معنوں میں مجرمانہ ذہنیت ہے کہ اس میں ایک دینی مدرسہ میں ہونے والے ایک قبیح فعل کی پردہ پوشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

آپ اگر پاکستانی ہیں تو یہ سبق یاد رکھیں

تحریر: جاوید چوہدری

آپ اگر پاکستانی ہیں اور آپ اور آپ کا خاندان اگر اس ملک میں رہنا چاہتا ہے تو آپ کو یہ چند سبق اپنے دماغ کی گرہ سے باندھ لینے چاہئیں۔

پہلا سبق

ہمارے ملک میں کسی بھی وقت کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے‘ آپ کو یقین نہ آئے تو ذوالفقار علی بھٹو‘ جنرل ضیاء الحق‘ غلام اسحاق خان‘ فاروق احمد لغاری‘ بے نظیر بھٹو‘ جنرل پرویز مشرف اور شریف فیملی کا تجزیہ کر لیجئے‘ یہ لوگ ملک کے طاقتور ترین لوگ تھے لیکن ان کا کیا حشر ہوا‘ ان کا کیا حشر ہو رہا ہے؟ آپ ملک کے پانچ سابق آرمی چیفس کا پروفائل بھی نکال کر دیکھ لیجئے‘ آپ کو ان کی حالت پر بھی ترس آئے گا‘ آپ چیف جسٹس حضرات کے ساتھ ہونے والی ”ان ہونیوں“ کی فہرست بھی بنا لیں‘ آپ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو دیکھ لیجئے‘ ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں چیف جسٹس انصاف کیلئے عوام کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا‘ میں نے اپنی آنکھوں سے پولیس کے طاقتور افسروں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں‘ ججوں کو اپنی فائلیں اٹھا کر مارے مارے پھرتے دیکھا اور نیب کے افسروں کو تحریری معافی مانگتے دیکھا‘ میں نے ملک کے طاقتور ترین سیاسی خاندان کو پورے خاندان سمیت جے آئی ٹی کے سامنے پیش ہوتے اور عوام کے سامنے دہائیاں دیتے بھی دیکھا‘ میں نے جنرل پرویز مشرف کو ملک سے بھاگتے بھی دیکھا‘ میں نے ملک کے نامور بیوروکریٹس کو جیلوں میں دھکے کھاتے بھی دیکھا اور میں نے مرتضیٰ بھٹو جیسے لوگوں کو بے نظیر بھٹو کی حکومت میں کراچی کی سڑک پر تڑپتے بھی دیکھا‘ صدر ایوب خان کے دور میں ملک میں ۲۲ امیر ترین خاندان تھے‘ وہ تمام خاندان بھٹو کے دور میں ختم ہو گئے‘ بینکوں اور بحری جہازوں کے مالک دس برسوں میں کوڑیوں کے محتاج ہو گئے‘ دنیا کی سب سے بڑی کارگو کمپنی کراچی میں تھی‘ اس کے پاس ساڑھے تین سو بحری جہاز تھے‘ آج اس کا مالک لاہور میں گمنام زندگی گزار رہا ہے‘ چو این لائی بیکو کمپنی کی فیکٹری دیکھنے لاہور آئے تھے‘ بیکو کے مالک سی ایم لطیف بعد ازاں جرمنی کے ایک گاؤں میں گمنام زندگی گزار کر فوت ہوئے‘ شریف فیملی تین بار زیرو ہوئی‘ ملک ریاض ملک کے امیر اور بااثر ترین شخص ہیں‘ میں انہیں ۲۰ سال سے حکومتوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھ رہا ہوں‘ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت پانچ برسوں میں اپنی لیڈر بے نظیر کو انصاف نہ دے سکی آصف علی زرداری کے خلاف آج بھی کرپشن کے مقدمے چل رہے ہیں‘ میاں نواز شریف اقامے کی بنیاد پر نااہل ہو چکے ہیں‘ شہباز شریف کے خلاف ۱۴ لوگوں کے قتل کی سماعت شروع ہو رہی ہے اور یوسف رضا گیلانی کے بیٹے حج سکینڈل اور ایفی ڈرین کا تاج سر پر سجا کر پھر رہے ہیں جبکہ جنرل پرویز مشرف کے ریڈ وارنٹ جاری ہو رہے ہیں چنانچہ آپ جنرل ہیں‘ سیاستدان ہیں‘ جج ہیں‘ بزنس مین ہیں‘ بیوروکریٹ ہیں یا پھر عام انسان ہیں ہمارے ملک میں کسی بھی وقت کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور آپ کو اس ملک میں بہر حال اس خوف کے ساتھ زندگی گزارنی ہو گی‘

دوسرا سبق

آپ اگر اس ملک میں خوش حال ہیں اور غیر معروف ہیں تو پھر آپ کو کوئی خطرہ نہیں‘ آپ لاکھوں لوگوں سے بہتر زندگی گزار سکتے ہیں‘ آپ پھر تمام محکموں‘ تمام اداروں کو ”مینج“ کر لیں گے‘ آپ صبح اٹھیں‘ ناشتہ کریں‘ دفتر جائیں‘ پیسے کمائیں‘ شام کو واک کریں‘ فیملی کے ساتھ اچھا وقت گزاریں اور نو بجے سو جائیں‘ آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا لیکن جس دن آپ کے پاس پیسے کم ہو گئے یا آپ ”لائم لائیٹ“ میں آ گئے یا لوگ آپ کے نام اور شکل سے واقف ہو گئے اس دن آپ کی زندگی عذاب ہو جائے گی اس دن آپ دھوتی سنبھالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

تیسرا سبق

ہمارے ملک میں *انسان کے پاس پیسہ ضرور ہونا چاہیے لیکن یہ ضرورت سے بہت زیادہ نہیں ہونا چاہیے‘ *آپ کے پاس اگر پیسہ نہیں تو عذاب ہے اور یہ اگر بہت زیادہ ہے تو یہ بہت بڑا عذاب ہے‘ میں نے پوری زندگی کسی شخص کو بھوک سے مرتے نہیں دیکھا لیکن میں لوگوں کو زیادہ کھانے کی وجہ سے روز مرتے دیکھتا ہوں‘ میں لوگوں کو غربت کی وجہ سے پریشان دیکھتا ہوں لیکن میں نے آج تک کسی رئیس شخص کو بھی خوش نہیں دیکھا‘۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو غربت نہیں مارتی ہمیشہ امارت مارتی ہے‘ آپ کے پاس اگر ضرورت سے چار گناہ زیادہ دولت موجود ہے تو پھر آپ کسی دن اپنے سالے‘ بہنوئی‘ بھائی‘ داماد یا پھر نالائق بیٹے کی ہوس کا لقمہ بن جائیں گے‘ میں نے آج تک رئیس لوگوں کو صرف کورٹس‘ کچہریوں‘ ہسپتالوں اور قبرستانوں میں دیکھا ہے‘ میں نے انہیں والد کے جنازے میں بھی

لڑتے دیکھا چنانچہ آپ اگر اچھی اور پرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو* اپنی دولت کو کسی بھی حالت میں خوش حالی سے اوپر نہ جانے دیں۔

آپ کا بیٹا جس دن کھڑے کھڑے ڈیڑھ دو کروڑ روپے کی گاڑی خرید لے یا پھر اپنی گھڑی' اپنی گاڑی اور اپنا گھر جوئے پر لگا دے یا ایک دو کروڑ روپے کی جائیداد ٹیلی فون پر بیچ دے آپ اس دن ڈر جائیں' آپ اس دن اپنی آدھی رقم خیرات کر دیں ورنہ دوسری صورت میں آپ کا اختتام ہسپتال یا پھر سڑک پر ہوگا' میں ایک صاحب کو جانتا ہوں' وہ خوشحال تھے' وہ جو کماتے تھے وہ اپنے اوپر' اپنے خاندان کے اوپر اور اپنی آل اولاد کی تعلیم پر خرچ کر دیتے تھے اور جو بچ جاتا تھا وہ اسے خیرات کر دیتے تھے' وہ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے ترکے میں کچھ نہیں تھا' ان کے بچے آج بھی اکٹھے رہ رہے ہیں' یہ سب یک جان' یک قالب ہیں جبکہ ان کے دوسرے بھائی نے زندگی بھر دولت کمائی' وہ اپنے بچوں کیلئے کروڑوں روپے چھوڑ کر گئے' بچے والد کے انتقال کے بعد جائیداد کیلئے لڑے اور یہ آج تک لڑ رہے ہیں' سگے بھائی' بہن ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں چنانچہ آپ کوشش کریں آپ کی دولت خوش حالی سے اوپر نہ جائے' یہ اگر چلی جائے تو آپ اسے ویلفیئر میں لگا دیں' آپ بھی بچ جائیں گے' آپ کا خاندان بھی اور معاشرہ بھی۔

چوتھا سبق

آپ جہاں تک ممکن ہو* ڈاکٹر اور ادویات سے پرہیز کریں' * میں نے پاکستان میں ادویات' ڈاکٹروں اور ہسپتالوں پر اعتبار کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ روتے دیکھا' ملک میں پرائیویٹ میڈیکل کالجز ڈاکٹروں کی بجائے قصائی پیدا کر رہے ہیں' یہ ناتجربہ کار بھی ہیں اور اناڑی بھی' پرائیویٹ ہسپتال باقاعدہ مذبح خانے ہیں' آپ پیٹ درد لے کر جائیں گے اور یہ آپ کا پورا پیٹ کھول کر رکھ دیں گے' آپ انجیکشن لگواتے اور آپریشن کرواتے ہوئے دس دس مرتبہ "کاؤنٹر چیک" کر لیا کریں' میں نے بے شمار مریضوں کو "اوور ڈوز" اور غلط انجیکشن کی وجہ سے مرتے دیکھا' میرے ایک دوست ایک وقت میں صرف ایک انجیکشن خریدتے ہیں' یہ دو دن سے زائد دواء بھی نہیں خریدتے' یہ کہتے ہیں میں نے ایک بار دو انجیکشن لے لئے تھے' نرس نے مجھے دونوں انجیکشن اکٹھے لگا دیئے تھے اور میں مرتا مرتا بچا تھا' ایف بی آر کے ایک ممبر نے بیٹے کیلئے انجیکشن کی بڑی شیشی خرید لی' شیشی میں دس دن کی ڈوز تھی' بچے کو روز ایک سی سی انجیکشن لگنا تھا لیکن نرس نے پوری شیشی ڈرپ میں ڈال دی'

بچہ تڑپ کر مر گیا' ہم آئے روز دایاں کی بجائے بایاں گردہ نکلنے اور رائیٹ کی بجائے لیفٹ آنکھ کے آپریشن کی خبریں سنتے رہتے ہیں اور میرے ایک دوست بال لگوانے اور دوسرے پیٹ کی چربی کم کرانے (لائپوسکشن) کی وجہ سے انتقال کر چکے ہیں چنانچہ آپ کوشش کریں آپ کسی قسم کی کاسمیٹک سرجری نہ کرائیں' آپ آپریشن ہمیشہ تجربہ کار اور سمجھدار سرجن سے کرائیں خواہ آپ کو اس کی کتنی ہی فیس کیوں نہ ادا کرنی پڑ جائے اور آپ کو جب کوئی ڈاکٹر دوائی لکھ کر دے تو آپ اس نسخے کو کسی دوسرے ڈاکٹر کو بھی چیک کرا لیا کریں' آپ کوشش کریں آپ کم کھانا کھائیں' روزانہ ورزش کریں اور گھی اور چربی استعمال نہ کریں' یہ تین عادتیں آپ کو ڈاکٹر' ہسپتال اور ادویات سے دور رکھیں گے اور یوں آپ اپنی موت اپنے ہاتھوں سے لکھنے سے بچ جائیں گے۔

پانچواں سبق

انسان کیلئے *ایک اللہ' ایک بیوی اور ایک موبائل کافی ہوتا ہے' * میں نے ہمیشہ زیادہ خداؤں' زیادہ بیویوں اور زیادہ موبائل والے لوگوں کو پریشان دیکھا' یہ اکثر اوقات جلدی فوت ہو جاتے ہیں' پاکستان جیسے معاشرے میں ایک کے بعد دوسری شادی حماقت ہے' آپ اس حماقت سے جتنا بچ سکتے ہیں آپ بچ جائیں' دوسرا موبائل بھی انسان کی ٹینشن میں ہزار گنا اضافہ کر دیتا ہے اور آپ اگر ایک خدا سے مطمئن نہیں ہیں تو پھر آپ نعوذ باللہ ہزاروں خداؤں سے بھی خوش نہیں ہو سکتے چنانچہ ایک اللہ' ایک بیوی اور ایک موبائل فون زندگی اچھی گزرے گی ورنہ پوری پوری بربادی ہے۔

چھٹا سبق

آپ یہ بات پلے باندھ لیں آپ کو اس معاشرے میں* روزانہ عزت نفس اور انا کی قربانی* دینا پڑے گی' آپ جب بھی گھر سے باہر نکلیں گے' آپ جس کے ساتھ بھی لین دین کریں گے اور آپ جس سرکاری یا غیر سرکاری دفتر میں جائیں گے آپ کے ساتھ دھوکہ بھی ہوگا' آپ کے ساتھ وعدہ خلافی بھی ہوگی اور آپ کی عزت نفس بھی ضرور روندی جائے گی چنانچہ آپ جب بھی کسی سے ملیں اور آپ جب بھی کسی کے ساتھ ڈیل کریں آپ ذہنی طور پر انا کی قربانی کیلئے تیار رہیں آپ کو کم تکلیف ہوگی ورنہ آپ بہت جلد بلڈ پریشر کے مریض بن جائیں گے' آپ میانی صاحب پہنچ جائیں گے۔ ❁❁❁

اشتہارات کے لیے
رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔
http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

ہے کوئی فکرِ یوسف کا خریدار؟

تحریر: فرخ نذیر

حکیم الامت شاعر مشرق اپنے کلام میں انسانیت بالخصوص مسلم قوم کو بیداری کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

یوسف من بحراین بازار نیست   عصر من دانندہ ای اسرار نیست

یعنی جس زمانے میں رہتے ہوئے یہ انداز فکر یوسف، اپنے افکار اور اپنی آراء قوم کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں افسوس ہے کہ اس کا کوئی خریدار نظر نہیں آتا، کوئی ایسا صاحب اسرار ہی نہیں جو اس فکر، اس پیغام کو لے کر آگے چل سکے اور پھر اس کے ساتھ ہی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ میرا یہ پیغام آنے والی نسل کے لئے ہے جسے کہ آگے چل کر مخبر صادق پیغمبر خدا ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق قرب قیامت مسلمانان برصغیر اور ملت اسلامیہ کی قیادت کرنی ہے۔ اگر ہم موجودہ اہل ادب، اہل علم، اہل مذہب اور دیگر نام نہاد دانشوروں کے انداز فکر اور طرز عمل کو دیکھیں تو بحیثیت انسان مایوسی کا گمان ہوتا ہے کہ ہم اپنی موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے کس طرح سے ذہن سازی کر رہے ہیں، اگر غیر جانبداری اور گہرائی سے جائزہ لیں تو جس قدر جاہلیت، جہالت، بے شعوری اور کم مائیگی کا احساس اب ہوتا ہے وہ شاید پہلے کبھی نہ ہو۔ ہم زمانے کی تیز رفتاری اور ترقی میں جدید علوم اور نت نئی ایجادات کی طرف تو مائل نظر آتے ہیں مگر جو صحیح راہ عمل اور انداز فکر ہے اس سے کوسوں دور ہیں۔ وہ راہ عمل اور انداز فکر جو ہمیں اپنانا چاہئے وہ ہے کیا آخر وہ ہے بحیثیت انسان ہماری شخصیت، ہماری حقیقت، ہماری خود شناسی اور پہچان، ہماری شخصیت کی ساخت اور اس کی پرورش کا ادراک۔ دور حاضر میں مسلمان جو روبہ زوال ہیں تو اس کی وجوہات میں سے ایک سب سے بڑی وجہ خود فراموشی ہے، ہم اپنی خودی کھو چکے ہیں، اپنی شخصیت اپنی پہچان، اپنے خدا یہاں تک کہ اپنے نفس یعنی اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھے ہیں، اسی سے متعلق اللہ کریم اپنی کتاب میں ہمیں سورہ حشر میں ان الفاظ میں خبردار کر رہے ہیں: ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم یعنی ایسا نہ ہو کہ تم خدا فراموش ہو جاؤ اور اس کے نتیجہ میں تم اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھو۔

آج ہم بطور مسلم قوم بالخصوص عوام پاکستان جس قدر سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، فکری اور اخلاقی پستی کا شکار ہیں وہ قیام پاکستان کے وقت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے موجودہ نسل کے طرز عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اس بات کا ادراک و احساس مفقود ہے اور دور تک نظر بھی نہیں آ رہا کہ شاید ہی آگے چل کر ان کی کسی نسل میں یہ احساس اجاگر ہو۔ ان کے دھیان، ان کے طرز عمل، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے رجحانات کسی اور ہی منظر نامہ کو بیان کرتے نظر آتے ہیں جو کہ سراسر گھاٹے اور پستی کی طرف جاتا ہے۔ ہماری وہ قابل رشک شیرازہ بندی جس کی تشکیل پیغمبر رسولؐ کے دست مبارک سے ہوئی تھی کب کی بکھر چکی ہے، ہمارا نظام منتشر ہو چکا ہے اور ہمارے اندر ایسے عوامل اثر پذیر ہو چکے ہیں جنہوں نے ہماری انسانیت، شخصیت، ایمانی اور ملی شناخت کو بری طرح گہنا کے رکھ دیا ہے۔ ہم علمی و نصابی حد تک تو اس سے آگاہ ہیں مگر عملی طور پر اس سے کہیں کوسوں دور۔

آج ہم بجائے اس کے کہ ایک متفقہ منشور پر عمل پیرا ہوں اپنا اپنا مکتبہ فکر بنا کر اسی کو ہی راہ ہدایت الٰہی کے طور پر پیش کرتے چلے جا رہے ہیں اور دین الٰہی کا جو حلیہ اور عملی شکل ہم ترتیب دے رہے ہیں وہ اصل ترتیب کے منافی ہے کیونکہ ہم نے اپنے اپنے مکتبہ فکر اور مفادات کے مطابق معنی و مطالب تلاش کر لئے ہیں، حالانکہ دین الٰہی کی اصل ترتیب و حلیہ وہی ہے جو رسالت مآبؐ نے ہمارے سامنے پیش کیا اور جو بعینہ اصطلاح قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔

آج ہم جو ہدایت نامہ اور نظام دین خود پر لاگو کرنا چاہ رہے ہیں وہ ایک مذاق، دھوکہ، فریب اور الفاظ کے گورکھ دھندہ کے سوا کچھ نہیں ہے، کیونکہ جب تک ہم حقیقی اصطلاح قرآن کے مطابق بطور اُمت اپنی تشکیل نہیں کرتے، اپنے دلوں کو فکری و عملی طور پر اس کے مطابق نہیں ڈھالتے تب تک یہ ہدایت ہمارے دلوں میں اتر سکتی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے، چاہے ہم اپنے اندر جتنی مرضی کثرت عمل اور کثرت جمعیت پیدا کر لیں۔ درست راہ عمل اور تشکیل امت کے لئے سب سے پہلے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہو گا کہ ہم انسانوں کا قطع نظر مذہب و ملت کے ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے اور ہم کس بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک اجتماعی معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں۔

دنیا جہان کے مذاہب اور علوم فلسفہ اسی ایک بنیادی سوال کہ ہماری اجتماعیت کی بنیاد کیا ہے، کے گرد گھوم رہے ہیں اور اپنے اپنے انداز فکر کے مطابق جواب پیش کر رہے ہیں۔ اسی راز سے پردہ اٹھانے اور گم شدہ ڈور کا سرا تلاش کرنے کے لئے اللہ کریم نے ہم انسانوں کی طرف مختلف ادوار میں حضرت آدمؑ سے لیکر خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ تک مختلف انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمایا اور انہیں راہ ہدایت کا ذریعہ بنا کر ہماری طرف بھیجا۔ یہ مقدس ترین ہستیاں ہم منتشر، پراگندہ اور پست ذہنیت لوگوں کو ایک راہ روشن کی طرف لانے، ایک اجتماع میں پرونے اور ایک شکل دینے کے لئے کلام اللہ کی صورت ہمیں دعوت الٰہی دیتے رہے ہیں، اسی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے پیغمبر آخر زماں رسول اکرم محمد ﷺ کتاب اللہ اور اپنی سیرت حسنہ کے ذریعہ ہمیں وحدت اُمہ کی دعوت دے رہے ہیں اور یہی تعلیمات نبوت، تعلیمات وحی اجتماعیت کی بنیاد ہیں اور اسی اجتماع میں ہم انسانوں کے لئے ہدایت ہے، یاد رہے کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں اگر ہماری بنیاد ان تعلیمات نبوت وحی پر مبنی نہیں ہو گی تو ہمارے اندر انسانیت زوال کا شکار ہو گی۔ ہماری بقا، دینی و دنیاوی کامیابی و عظمت اور اخروی نجات کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ ہم تمام تر علاقائی، لسانی، ثقافتی، سیاسی، معاشی، نسبی اور نسلی مفادات کو پس پشت رکھتے ہوئے خاتم الانبیاء رسول اللہؐ کی دی گئی تعلیمات جو انہیں اللہ کریم نے دیگر انبیاء علیھم السلام کی طرح عطا فرمائیں کو بنیاد بنا کر اپنی ملت کی تشکیل کریں انہیں عملی طور پر اپناتے ہوئے اپنے وجود کے اندر منتقل کریں اور وحدت اسلامیہ کا عملی نمونہ بن کر دنیا کے سامنے ایک بار پھر عالمی قوت بن کر اُبھریں۔

پڑھی لکھی پارلیمنٹ

تحریر: چوہدری پرویز مسیح مٹو

سقراط کا کہنا تھا کہ برداشت سوسائٹی کی روح ہوتی ہے۔ جب سوسائٹی میں برداشت کم ہوجائے تو مکالمہ کم ہوجاتا اور جب مکالمہ کم ہوجاتا ہے تو معاشرے میں وحشت بڑھتی ہے۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے ہروقت پاکستان کو یاد کرنا اور اس کے متعلق بات کرنا کیا ضروری ہے؟ اپنے آبائی وطن پاکستان کی محبت ہمیں اکثر اس بارے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہمارے استاد صحافی محبوب الٰہی بٹ اکثر زور دے کر غصے سے یہ کہتے ہیں کہ آئندہ کوئی پاکستان کے بارے میں بات نہ کرے کیونکہ یہاں برطانیہ اور یورپ میں آباد ہونے والی پاکستانی کمیونٹی کے مسائل کوئی کم نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں غور کرنا چاہیئے۔ تاہم ان کی کمند بھی اسی پر ہی ٹوٹتی ہے کہ جب وہ محفلوں میں پاکستان کے حالات پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ اگر برطانیہ و یورپ کی حکومتوں کا سلوک دیکھا جائے تو ان کا حسن سلوک ہمیں پیچھے دیکھنے کب دیتا ہے۔

جس تنگدستی، ناانصافی، مذہبی اور سیاسی اور معاشرتی نفرتوں سے تنگ لوگ یورپ اور برطانیہ میں بھاگ کر اچھی زندگی گزارنے آتے ہیں، پھر انہی معاشروں کو یاد کرکے ناانصافی نہیں کرتے؟ جس طرز حکومت اور معاشرتی انصاف کے خواب پاکستان سے ہجرت سے قبل وہ دیکھتے تھے وہ سب یہاں موجود ہیں۔ برطانیہ نے ہمیں اپنے مقامی شہریوں کے برابر مقام دے رکھا ہے۔

کچھ اوورسیز لوگوں کا استدلال ہے کہ برابری کے یہ حقوق بزور بازو حاصل کئے گئے ہیں۔ اس بات کو مان بھی لیتے ہیں لیکن میرے خیال میں ایسا ہرگز نہیں۔ ۲ء۵ فیصد لوگوں کا ۹۷ء۵ آبادی سے بزور قوت کسی غیر مقامی کے حقوق حاصل کرنا ناممکن ہے۔

پاکستان میں اقلیتیں آبادی کے لحاظ سے گذشتہ ۷۳ سال میں ۹ فیصد سے ڈھائی فیصد تک آگئی ہیں۔ اقلیتیں اپنے ملک میں اپنا نمبر قائم نہیں رکھ سکیں اور نہ ہی بڑھ پائی ہیں کیونکہ حکومتوں اور اکثریت نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اقلیتوں کی جائیدادوں پر حکومتوں اور اکثریت نے خوب ہاتھ صاف کئے۔ اس بات کو بہر حال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مسیحی لوگ بھی یا تو لالچ میں یا کسی سے خوفزدہ ہوکر اس مکروہ کام میں شامل ہیں لیکن سوال یہ کہ پاکستان میں اقلیتیں محفوظ کس حد تک ہیں۔ آئے دن لڑکیوں کے اغواء ان کی زبردستی شادیوں اور تبدیلی مذہب کے واقعات ہو رہے ہیں۔ اقلیتی عبادت گاہوں کی توہین اکثر ہوتی رہتی ہے۔ پاکستانی اقلیت کسی سطح پر بھی اپنا دفاع نہیں کرپاتی اور نہ ہی اپنے حقوق کے لئے کوئی تحفظ اقلیت بل یا قانون بنوا سکی ہے۔ اس میں سول سوسائٹی، ہیومن رائٹس ایکٹویسٹ اور انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کمیشن کی کوششیں بھی کارگر ثابت نہیں ہوپائیں۔

برطانیہ میں لوگوں کو یکساں انصاف اور تحفظ فراہم کرنے کے قوانین بنائے گئے تو یہ انہی اقوام کا خاصہ ہے۔ کسی خاص فرقے یا مذہب کے لئے قانون سازی نہیں کی جاتی بلکہ انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔ جس طرح پاکستان کی سول اور فوجی حکومتیں پاکستان میں قوانین بناتے ہوئے اشرافیہ کے مفادات کا سوچتے ہیں، برطانیہ میں ایسا سوچنا بھی جرم، گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں جو کوئی قانون ہاتھ میں لیتا ہے اسے قرار واقعی سزا دی جاتی ہے۔ وہ بھی بغیر رنگ و نسل اور مذہب کی تفریق کے جبکہ پاکستانی حکومت کے اکثر اقدامات متنازع اور عدالتی فیصلے کیس کی روح کے مطابق نہیں ہوتے۔ برطانیہ کے لوگوں کا عدالتوں اور قانون نافذ کرنے والے اداوروں پر مکمل بھروسہ ہے۔ لوگ قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتے اور اگر ایسا ہوجائے تو اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ ہر برطانوی حکومت معاشرے میں اخلاق، پیار محبت، قوت برداشت اور مذہبی ہم آہنگی بڑھانے کے لئے پروگرام اور سکیمیں متعارف کرواتی ہے۔ جس کے لئے باقاعدہ فنڈ مہیا کئے جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اپنے نمائندوں کی اخلاقی قانونی اور سیاسی تربیت کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ کونسلیں بھی منتخب نمائندوں کو ٹریننگ دیتی ہیں۔ مزید یہ کہ ہر سیاسی پارٹی اور تنظیم اپنے فنڈز اور اکاؤنٹس میں شفافیت کی پابند ہے۔ حکومتی ادارے اس کو چیک کرنے کے مجاز ہیں۔

پچھلے ماہ جون میں پاکستان کی اسمبلی میں پیش ہونے والے بجٹ کے موقع پر، چند حکومتی اور اپوزیشن پارلیمنٹیرین کے اندر کے انسانوں کو دیکھنے کا موقع ملا کہ پاکستان کو چلانے والے اور ملکی قوانین بنانے والے کس قدر ”خوبصورت اخلاق“ اور زبان کے لوگ ہیں۔ جن کو اپنے وقار اور عہدے کا بھی احساس نہیں۔ مزید جن میں ندامت نام کی بھی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ بازاری اور غلیظ زبان کا آزادنہ استعمال کیا گیا۔ بیرون ملک بیٹھے ہوئے پاکستانی اس ساری کاروائی پر بہت نادم ہیں۔

پاکستان ایک اسلامی جمہوری ملک ہونے کا دعویدار ہے۔ یہ سب کچھ اس کے شایان شان نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اچھا کیا ہو رہا ہے؟ اوورسیز میں پاکستانی کئی دھائیوں

سے رہتے ہیں لیکن ان کو ابھی تک یہ بھی علم نہیں کہ ملک کا وقار یا معیار کیا ہوتا ہے؟ کسی ملک کا وقار معاشرے میں مکالمہ میں قوت برداشت مذہبی ہم آہنگی قانون کی پاسداری اور برابری سے قانون کا لاگو ہونا ہوتا ہے۔ قانون بھی وہ جس میں اقلیت یا مذہب کی تفریق نہ ہو۔ ان باتوں سے ملکی وقار یا معیار پرکھا جاتا ہے۔ جس ملک کے حکمران یا امراء قانون کو اپنی لونڈی یا باندی سمجھیں۔ قانون صرف اور صرف غریبوں اور اقلیتوں پر لاگو ہو' تو اس ملک کا وقار کا حال بیشک پاکستان جیسا ہی ہوگا۔ پاکستان میں اوپر سے نیچے تک مکالمہ مذہبی' معاشرتی ہو یا پھر سیاسی ہو اس میں قوت برداشت نہیں پائی جاتی۔ مزید لاقانونیت مذہبی و فرقہ وارانہ نفرت اور معاشرتی نفرت کو پورے معاشرے میں عروج حاصل ہے۔ عوام کے علاوہ حکومت بھی اپنے کام اور سرکار بددیانتی' چالاکی اور غیر آئینی حربوں سے چلاتی ہیں۔ حکومت نے میڈیا کا گلہ دبا کر رکھا ہوا ہے اور اس میں مزید دباؤ بڑھاتی جا رہی ہے۔ تاکہ ان کی غلطیاں عوام کے سامنے نہ آئیں۔ یہاں تک کہ حکومتیں سوشل میڈیا اور حکومتی اداروں کے ذریعے عدالتوں میں مداخلت بھی کرتی ہے۔ عوامی معیار کا یہ حال ہے کہ تقریباً ہر سیاسی پارٹی کا کارکن اخلاقی پستی کی تہہ تک پہنچا ہوا ہے۔ وہ مذہب کے نام پر سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن اقلیت کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق بنیادی انسانی حقوق دینے کو تیار نہیں ہے۔ حکومت اپنے مخالفین کو مقدمات میں الجھا کر یا دھمکا کر ان کی ہمدردیاں تبدیل کروالیتی ہے جس طرح اقلیتوں کو قانونی اور معاشرتی نفرت میں پھنسایا ہوا ہے۔ انہیں احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے ایمان کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عوام کے ساتھ حکومتی ادارے بھی شامل ہیں۔ اس وقت پاکستانیوں کا مزاج بہت مختلف ہے۔ جس میں حزب اختلاف کا تنقید کرنا حکومت وقت کو اچھا نہیں لگ رہا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن لڑنے سے قبل تمام امیدواروں کا کریکٹر چیک ہونا چاہئے جس کے لئے قانون سازی کی ضرورت ہے کہ عوام کی نمائندگی کے لئے خود کو آگے کرنے والے کہیں کسی جرم میں سزا یافتہ یا کسی الزام میں مطلوب تو نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہو تو انہیں عوام کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور انہیں جمہوری عمل سے دور رکھنا ضروری ہے۔

ادھر کسی غریب پاکستانی یا اقلیتی شخص کا غلطی سے بھی توہین رسالت میں نام آجائے تو علماء بغیر سوچے سمجھے خود ہی سزا دینے کے لئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ ردی اکٹھی کرنے والے مسیحی پر توہین رسالت کا الزام لگا کر مسیحیوں کے گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں تو کہیں شرابی مسلمان کے شرابی مسیحی دوست کے الزام لگانے پر جوزف کالونی جو دو سو گھروں پر مشتمل تھی کو جلا دیتے ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں بجٹ کی کاپیاں پتھر یا ہتھیار کے طور پر ایک دوسرے پر پھینکی اور ماری گئیں جن پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ بجٹ کی کاپیاں قومی اسمبلی کے ارکان کے پاؤں تلے روندھی گئیں لیکن پورے ملک میں سے توہین رسالت اور توہین مذہب پر احتجاج کی آواز بلند نہ ہوئی۔ مذہبی علماء نے بھی اب تو چپ ہی سادھ لی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ توہین رسالت ۲۹۵ سی قانون غریب پاکستانیوں اور اقلیتوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ امیر اور طاقتور پاکستانی سیاستدان اس سے بالاتر ہیں؟ پاکستان میڈیا اور سوشل میڈیا پر صاف نظر آرہا ہے کہ پاکستانی ایم این اے کسی طرح اسلامی آیات سے سجی ہوئی بجٹ کی کاپیاں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ جو ارکان پارلیمنٹ کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہیں۔ علماء کو تو اب سڑکوں پر نکلنا چاہئے اور توہین مذہب کے واقعہ پر احتجاج کرنا چاہئے۔ ارکان اسمبلی کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہئے جو کسی غریب مسلمان یا مسیحی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس بجٹ سیشن میں علماء بھی موجود تھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ نہ ہی یہ لوگ رمشاء مسیح لڑکی کی طرح ذہنی طور پر کمزور ہیں۔ ثبوت بھی موجود ہیں۔ ایف آئی آر درج کروائیں اور ان لوگوں کے خلاف قانون کے مطابق برتاؤ کریں۔ تاکہ آئندہ کوئی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔

اب تو چوہدری شجاعت حسین سے بھی ہمارا سوال بنتا ہے کہ مشرف دور میں توہین رسالت اور توہین مذہب پر ریویزٹ کی تجویز پر موصوف نے فرمایا تھا کہ ہم اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ جناب اب بھی آپ اقتدار میں شریک ہیں' اپنی اس سوچ کو سیاستدانوں پر کیوں لاگو نہیں کرواتے؟ اگر اس قانون کا اطلاق ارکان پارلیمنٹ پر نہیں ہوتا تو پاکستان کے غریب عوام اور اقلیتی عوام کو بھی اس سے نجات دلائیں۔ جس قانون پر معاشرے میں یکساں عمل درآمد ممکن نہ ہو یا پھر اس کی زد میں غریب پاکستانی یا اقلیت آتی ہو۔ یا جس قانون سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہو اسے ختم کرنے میں ہی پاکستان کی بھلائی ہے۔

❀❀❀

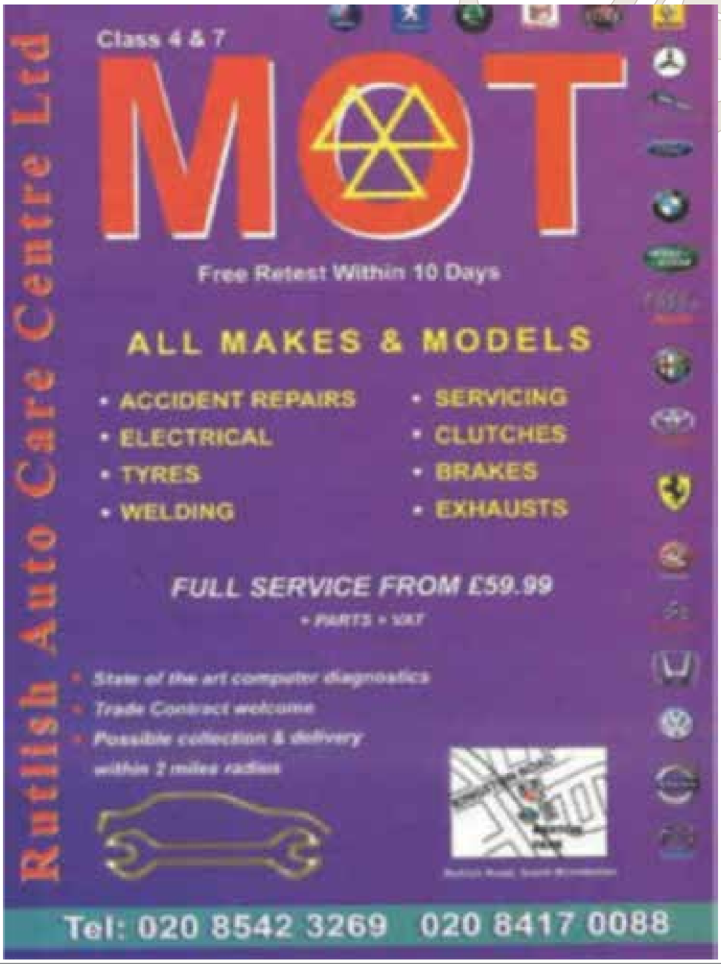

تعصب ہمیں کسی کروٹ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا

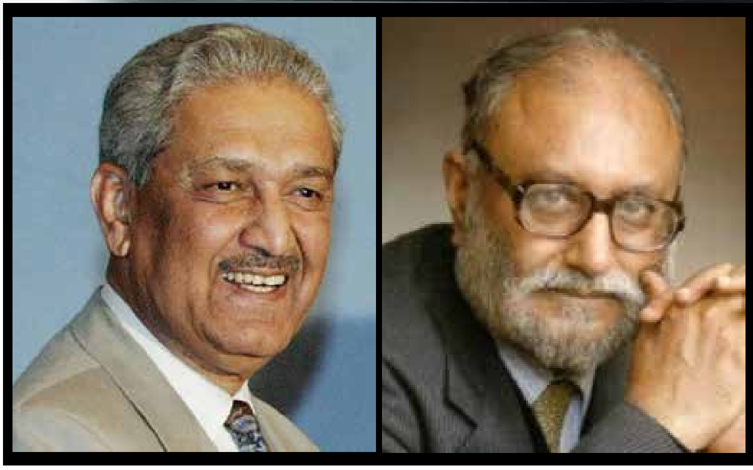

ہم سا سادہ ہوگا کون زمانے میں
کمتر کو اپنایا، بہتر دفن کیا

ہمارے ایک فاضل دوست ملالہ پر پتھر اچھالتے اچھالتے ہمارے دوسرے نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام تک پہنچ گئے۔

موصوف کا خیال ہے کہ ہمارے مشاہیر کی فہرست میں ڈاکٹر عبدالقدیر کا نام ہونا چاہیے پر ڈاکٹر عبدالسلام کی چونکہ ملک کے لیے کوئی خدمات نہیں ہیں اس لیے ان کا ذکر مشاہیر میں ممکن نہیں، ممکن نہیں، ممکن نہیں۔ ہم بس یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب پاکستان میں کسی نے ڈاکٹر عبدالقدیر کا نام بھی نہیں سنا تھا تو اٹلی کے مرکز برائے نظری طبعیات کی سربراہی چھوڑ کر جو سائنس دان ملک لوٹا اور ایٹمی توانائی کمیشن سے وابستہ ہوا، اس کا نام عبدالسلام تھا۔ آتے ساتھ ہی اس کی وجہ سے پہلی دفعہ پاکستان کے پانچ سو سائنسدانوں کو ایٹمی توانائی سے متعلقہ پانچ سو عالمی وظیفے ملے۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں عبدالسلام آئے تو منیر احمد خان کو بھی لیتے آئے اور امریکا سے اوپن پول ری ایکٹر کی باقاعدہ لابنگ کا حصہ رہے۔ یہ بات ۱۹۵۸ کی ہے۔ ابھی بیچارے ڈاکٹر عبدالقدیر کی تعلیم مکمل ہونے میں برسوں باقی تھے۔

قائد اعظم یونیورسٹی میں مرکز برائے نظری طبعیات بھی ڈاکٹر عبدالسلام نے قائم کیا جس سے آج تک ہزاروں طالب علم فیض یاب ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد، رضی الدین اور عشرت عثمانی جیسے لوگوں کو بھی پاکستان واپس آنے پر راضی کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے کہنے میں آ کر سرن جیسی جگہوں کو چھوڑ کر واپس آئے اور اس ٹیم نے پہلی دفعہ ملک میں پلوٹو نیئم اور یورینیم کی کھوج شروع کی، پی اے ای سی کو ایک باقاعدہ قومی ادارے کی شکل دی۔ جوہری توانائی کمیشن کے لیے اسی دور میں پہلی دفعہ خطیر رقوم کو بجٹ میں مختص کرانا بھی انہی کی بدولت تھا۔ وہی رقوم جن کی بعد میں خرد برد سے ڈاکٹر عبدالقدیر کی رہائش گاہ تعمیر ہوئی اور یہی فنڈ ان کی دوسری کم عمر اہلیہ کی این جی او میں بھی غرق ہوئے۔

۱۹۶۰ میں پاک امریکی خلائی تعاون کے مرکزی کردار بھی ڈاکٹر عبدالسلام تھے اور ۱۹۶۱ میں پسماندہ سمجھے جانے والے بلوچستان میں پاک امریکا تعاون سے ڈاکٹر سلام ہی نے برصغیر کا پہلا خلائی تحقیقاتی مرکز بھی قائم کر ڈالا۔ بیچارے ڈاکٹر عبدالقدیر کو خلائی تحقیق کے ججے آتے ہیں یا نہیں، اس کا آج تک کوئی صحافی سراغ نہیں لگا سکا۔

۱۹۶۵ میں ڈاکٹر عبدالسلام کی کوششوں سے پہلا پاک کینیڈا جوہری توانائی معاہدہ ہوا۔ اسی سال ڈاکٹر عبدالسلام کو بیچ میں رکھ کر امریکہ نے ہمیں ایک ری ایکٹر بھی دے ڈالا اور نیلور کے مقام پر ایڈورڈ سٹون کے ساتھ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے قیام کا معاہدہ بھی ڈاکٹر سلام ہی نے کیا۔ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی چوری اور بدمعاش ریاستوں کو ان کی فراہمی انہی اداروں سے البتہ ڈاکٹر عبدالقدیر کے دور میں ممکن ہو سکی۔ اس کے علاوہ ساٹھ کی دہائی میں ڈاکٹر عبدالسلام نے خلائی و بالائے فضائی تحقیقاتی امور پہ بھی بنایا جسے آج ہم سپارکو کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ادارہ پاکستان میں اس وقت بنا جب یورپ کے اکثر ممالک میں بھی خلائی تحقیق کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ پاکستان کے سارے سیارے اسی ادارے نے خلا میں چھوڑے ہیں پر آج اس کی ویب سائیٹ پر ڈاکٹر سلام کا ذکر منع ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر اس دوران ایک سیارے کی طرح انہی لوگوں کا طواف کرتے رہے جن کے نام آج سپارکو کی ویب سائٹ پر سائنس دانوں سے اوپر جگمگا رہے ہیں۔

صرف سپارکو کا ادارہ ہی نہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے زرمبادلہ پر کاری ضرب لگاتے ہوئے ہمارے خلائی سائنسدانوں کی تربیت کا ناسا سے معاہدہ بھی کروا ڈالا۔ ان کے بعد سے آج کے دن تک پھر کسی ایک سائنسدان کی بھی ناسا میں تربیت نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کے دور شہنشاہی میں کوئی ایک سائنسدان بھی کسی بین الاقوامی ادارے کے تربیتی مشن سے وابستہ نہ ہو سکا۔

بھٹو صاحب کے ایٹم بم والے خواب کی باگ ڈور بھی ستر کی دہائی میں ڈاکٹر عبدالسلام کو سونپی گئی تھی پر بھٹو کو جیسے احمدیوں کے حوالے سے عقل آئی ویسے یہ لگام بھی ان سے لے لی گئی۔ بیچارے ڈاکٹر صاحب کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج کی راہداریوں میں ذلیل ہونے کے بعد اس دیار کو لوٹ گئے جہاں ان کی واقعتاً قدر تھی پر مرتے دم تک وہ اپنے آپ کو پاکستانی ہی کہلاتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کے کریڈٹ میں یہ ہے کہ وہ سرکاری سند یافتہ مسلمان ہیں، سائنس دان بھلے نہ ہوں۔

اس مرد مومن جو نہ سائنسدان تھا نہ ماہر طبعیات بلکہ ایک میٹلر جیکل انجینئر تھا، کا واحد کارنامہ ہالینڈ میں اپنے ہی ادارے سے کچھ ایسی ڈرائینگز کی چوری تھی جس سے

سینٹری فیوجز کی تعمیر میں کچھ مدد مل سکتی تھی۔ ویسے ڈاکٹر ثمر مبارک مند سمیت ایٹم بم سے جڑے اکثر سائنس دان آپ کو یہ بتا دیں گے کہ بابائے ایٹم بم کا خطاب پانے والے عبدالقدیر صاحب کو ایٹمی توانائی کا کچھ پتہ نہیں تھا اور پروگرام کی بنیاد ان دستاویزات پر تھی جو ڈاکٹر عبدالسلام نے امریکہ کے مین ہٹن پروگرام کے حوالے سے مرتب کی تھیں۔ جہاں محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو زندگی میں ایک بھی سائنسی اعزاز نہیں ملا وہیں نوبیل انعام کے علاوہ ڈاکٹر سلام نے ملک کا نام روشن کرتے ہوئے سائنسی دنیا کا ہر بڑا اعزاز اپنے نام کیا جن میں ۱۹۵۰ کا سمتھ پرائز، ۱۹۵۸ کا ایڈم پرائز، ۱۹۶۴ کا ہیو تمغہ، ۱۹۶۸ کا جوہری امن انعام، ۱۹۷۸ کا شاہی تمغہ، ۱۹۷۹ کا نوبیل انعام، ۱۹۸۰ کا جوزف اسٹیفان تمغہ، ۱۹۸۱ کا لومنسو وسونے کا تمغہ اور ۱۹۹۹ کا کوپلے میڈل اور درجنوں ایوارڈ شامل ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی کم از کم ایک درجن نظری طبعیات کے مقالے ایسے ہیں جن سے طبعیات کی ایک نئی جہت کا تعین ہوا۔ گرینڈ یونیفائیڈ تھیوری، الیکٹرو ویک تھیوری، گولڈسٹون بوسن اور ہگز میکینکس بھی ان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ خدائی ذرہ کہلوانے والا ہگز بوسن بھی ان کی تحقیق کا تسلسل ہے۔ باقی ڈاکٹر عبدالقدیر کا کوئی تحقیقی مقالہ آپ کی نظر سے گزرا ہو تو ہمیں ضرور بتایئے گا۔ یہ البتہ ہمیں یاد ہے کہ آغا وقار کی پانی سے چلنے والی گاڑی کی حمایت سب سے پہلے انہی صاحب نے کی تھی جنہیں ہمارے فاضل دوست مشاہیر عالم میں گنتے ہیں جو کہ جعلی نکلی۔

پاکستان کے اسی عظیم ایٹمی پروگرام کو سب سے زیادہ خطرے میں ڈالنے والی بھی یہی شخصیت تھی جنہوں نے اس کی حساس دستاویزات ایران اور شمالی کوریا کو فروخت کی تھیں اور پاکستان کا ایٹمی پروگرام بند ہوتے ہوتے بچا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اپنا یہ گوہر نایاب مغربی جیلوں میں سڑنے سے بچایا۔

آج کل ڈاکٹر موصوف جنہیں ہمارے دوست محسن پاکستان اور سائنس دان اعظم کہنے پر مصر ہیں، اپنی عمر بھر کی تحقیق کے دم پر احمد رضا خان کے نعتیہ کلام، ختم نبوت، عید الفطر کی برکات، ماہ صیام، ادرک اور اسلامی شہد کے فوائد پر جنگ اخبار میں کالم لکھتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ مشاہیر میں گردانے جانے کے لیے اور بھلا کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ (منقول)

❋❋❋

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preperation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA
OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK
CELL +44 (0)7903 416 966
TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

شعبہ پاکستان

مذہب سے دوری اور معاشرتی پستی

تحریر: عفت نوید

انسان کی فطرت بھی عجیب ہے ڈرا کے رکھنا چاہتا ہے اور ڈر کے بھی رہنا چاہتا ہے۔ انسان نے ازل سے ہی کسی ایسی شے کی کھوج کی جس کو وہ طاقتور مان کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک سکے، اس کی عقل کے مطابق جو چیز جتنی گہرائی، وسعت، طاقت، دھک، فائدہ، اور خوف کا تاثر دیتی تھی وہ اسی کے زیرِ دام آجاتا تھا، اور اسے خدا مان کر خود کو اس کے تابع کر کے خود نفس کے تابع ہو جاتا تھا۔ یوں اچھائی برائی، سزا، جزا، انعام، عذاب کی فکر میں مبتلا رہ کر کبھی ظلم تو کبھی عجز کا مظاہرہ کرتا، مگر اس سب کے باوجود حقیقی معنوں میں وہ آسائش دینے والی چیزوں اور خود سے زیادہ طاقتور انسان ہی کے زیرِ اثر رہا، لیکن اسے دوسروں کے سامنے خود کو کسی طاقتور ہستی کے ساتھ سپردگی کے اعتراف میں ہمیشہ تسکین ملتی رہی خود کو کسی کے رحم کرم پر چھوڑ دینے کا احساس اسے ایک روحانی خوشی دیتا رہا۔

سجدہ کرنا، ماتھا ٹیکنا، اس کی رضا و منشا کے مطابق زندگی گزارنے کو ایک طرف تو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا رہا اور دوسری طرف اسے خود بھی ایسی ہی کوئی ہستی، یا چیز بننے کی خواہش رہی کہ ساری دنیا اس کے زیرِ نگیں ہو، وہ بلا شرکتِ غیرے دنیا پر حکمران ہو، ہوائیں، طوفان، سیلاب سب اس کی مرضی سے اپنا رخ بدلیں، وہ ہی لوگوں کا پیٹ بھرے، یا نہیں بھوکا رکھے، وہ انہیں موت یا زندگی دینے کا مجاز ہو یوں خشکی، کبھی سمندر اور سمندر کبھی خشکی میں تبدیل ہوا اور کروڑ ہا صدیاں بیت گئیں انسان نے دو پیروں پر چلنا شرع کیا اور اگلے دو پیروں کو اس نے ہاتھ بنا کر ان سے سر کھجانا شروع کر دیا، تب اسے اپنی انگلیوں میں نوکیلوں ناخنوں کا احساس ہوا، یہ ناخن اس کے پاس قدرت کی طرف سے بہت بڑا ہتھیا ر تھے، انسان کے جبلی ارتقائی عمل کے ساتھ ساتھ اسے اپنی پوشیدہ اور ظاہری صلاحیتوں کا علم ہوتا رہا اور وہ اپنی عقل، اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر انہیں حتی المقدور استعمال کرتا چلا گیا، پھر ساری دنیا میں صالح پیغمبرانِ کرام کا سلسہ شروع ہوا سب سے پہلے ان کی اطاعت اور احترام خطے کے چند طاقتور لوگوں کی جانب سے کیا گیا، جب دوسرے لوگوں نے طاقت اپنے ہاتھ سے جاتی دیکھی تو وہ پیغمبر اور ان کے ماننے والوں کے دشمن ہو گئے، یوں نیکی اور شر آمنے سامنے ہوئے تو کبھی اس لڑائی میں نیکی غالب آتی تو کبھی شر جیت جاتا لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ دائمی فتح نیکی کو ہی نصیب ہوئی۔ سچائی، نیکی، پرہیز گاری کا چلن خدا کے ان دیکھے تصور سے بھی پرانا ہے، اسی طرح، باطل، گناہ اور دھوکہ دہی کا چلن بھی ان کے ظاہری ہیبت ناک خدا سے پہلے کا ہے۔

جب مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہر پیغمبر اور نبی نے اسلامی شعائر کو عام کیا اور ایک ان دیکھے خدا کا تصور پیش کیا، تب انسان کو یہ تصور زیادہ فطری اور عقلی دلائل کے لیے معقول لگا۔ ان دیکھے خدا کی حاکمیت پوری کائنات پر تھی اور وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے حال بھی جان سکتا ہے دنیا کے وہ خطے جہاں مذہب کی عمداری مقدم ہے وہاں ہر انسان اپنے اپنے معلوم علم، معلومات، صحبت، دوستی اور میراث کی بنا پر اپنے بچوں کو اپنے عقیدے اور نظریے پر کاربند دیکھنا چاہتا ہے اس لیے شیر خواری سے ہی بچے کے ذہن میں اپنے باپ یا ماں کے دیے ہوئے عقائد و نظریات اس کے اندر ایک احساسِ برتری اور تخافر کے جذبات بھر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے عقائد کو درست مان کر دوسروں کے عقیدے کی درستی کی سعی کو اپنی زندگی یا موت کا مقصد بنا لیتا ہے۔ وہ خود کو خدا کر قریب محسوس کرتے ہوئے اس سے محبت کرتا ہے اور کسی گناہ یا غلطی کی صورت میں اس کی سزا کے خوف میں مبتلا ہو کر اپنے نیک اعمال کو مٹتے دیکھتا ہے تو اللہ سے معافی اور آئندہ غلطی نہ کرنے کا عہد کرتا ہے۔

مگر پھر انسان کی مکاریوں نے اللہ کی محبت اور اس کے خوف کو دل سے نکال کے اپنی زبان میں قید کر دیا اس مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اللہ کو ایک ماننے والے اس بات پر کامل یقین رکھنے اور دل و دماغ میں بسانے کے بجائے، اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ خدا ان کی نیتوں سے واقف ہے، ان کی شہ رگ سے قریب ہے وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہمارے ایک ایک عمل اور سوچوں پر اس کی نظر ہے اس کا پہرا ہے۔ جو کچھ ہے اسی نے عطا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی اور بعد از موت دائمی زندگی میں جزا اور سزا کا تصور پیش کیا گیا۔ یہ محض ایک تصور نہیں، اعلیٰ و ارفع پیغام بھی ہے اس پیغام کو انبیاء اور پیغمبرانِ کرام کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے عملی نمونے کی معرفت نافذ کیا گیا مگر افسوس ہم نے ان کے ذکر کو بھی کاروبار بنا لیا، ہم نے ایسے ادارے قائم کیے جہاں زبان و بیان میں شیرینی اور شخصیت میں کشش پیدا کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، یو ں ادارے قائم ہوتے رہے کاروبار چمکتا رہا، کمزوروں کو آخرت میں انصاف کی نوید دی گئی اور وہ یومِ حساب ظالم کا گریبان پکڑنے کی امید پر قبر میں جا لیٹا اور طاقتور دنیا میں جنت کے مزے لیتا اور آخرت میں بھی اس سے فیضیاب ہونے کے لیے، مساجد کی تعمیر، خواہش مندوں کو مکے کی زیارت اور صدقہ و خیرات میں اپنی دولت دان کر کے اپنے تیئں پاک کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

ان کی شان شوکت احترام و عقیدت نے لوگوں کو ان کی تقلید پر مجبور کیا، انہوں نے ایک قدم اور لیا اور جائز ناجائز دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنی شروع کر دی ہاتھ کی انگلیوں پر وظیفہ اور زبان پر میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، کا ورد رہنے لگا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، یہ کھوج بھی ضروری ہو گئی کہ بزورِ طاقت دوسروں کے عقیدے کو درست کیا جائے چنانچہ چوکوں چوراہوں اور منبروں سے اپنے دوسروں کے عقائد کو برا کہا جانے لگا سب کام چھوڑ چھاڑ لوگ اسی بحث میں مصروف ہو گئے، اور سرمایہ داروں وڈیروں اور جاگیرداروں کا محنت کش غلام طبقہ اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے اپنے جسم و جان، عزت اور خوہشات کی قربانی دیتا رہتا ہے، اس تک ایک اللہ کا پیغام، جنت کی نوید اور دوزخ کا خوف نہیں پہنچایا جاتا،

وہاں تومساجد تک بھی ان کی رسائی ہے نہ وقت۔

جب کہ ہمارے پاس نبی کے اعلیٰ اخلاق کی مثال، صبر، ایثار، نیکی اور ظالم کے خلاف ڈٹ جانے کے لیے مقدس کتاب سے فرامین موجود ہیں اب جیسے آپ اپنے بچے سے کہتے ہیں ماں باپ کو مسکرا کر دیکھنا بھی صدقہ ہے، صفائی نصف ایمان ہے یا ماں باپ جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو انہیں اف نہ کہو، جب ہم یہ تمام باتیں دینی عقائد کی روشنی میں کرتے ہیں تو کوئی طنز سے مسکراتا ہے نہ ڈھٹائی سے ترکی بہ ترکی کرتا ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ گھرانے جہاں مذہب کی عمداری کو اولڈ فیشن سمجھا جاتا ہے، وہاں بے معنویت نے لوگوں کی زندگی کو ڈپریسڈ کیا ہوا ہے، اولاد ماں باپ کی نصیحت سننا ہی نہیں چاہتی اور والدین بھی ان سے توقع نہیں رکھتے یوں مایوسی پھیلتی ہے، میاں بیوی بھی اپنے معاملات میں مکمل آزاد ہیں، یوں ایک دوسرے پر اپنا حق جتانے کا تصور دور ہوتا گیا، ہر انسان پرائیوسی کی چاہ میں تنہا ہوتا چلا گیا۔ تنہائی انسان کو نفسیاتی بحران مبتلا کر دیتی ہے۔ لیکن افسوس کہ مذہب کی دوری اور مذہب سے محبت دونوں میں انتہاپسندی کے فروغ کے باعث انسانیت کہیں پیچھے چلی گئی۔ اگر مذہب سے دوری یا قربت انسان کو انسان سے قریب کرتی محبت کو فروغ ملتا تو ہمیں ایک اللہ کافی تھا۔

لبرلز کے خیالات اور میڈیا کی بے لگام آزادی بہر حال ہمارے اختیار میں اور محدود پیمانے پر ہے، ہمارے اسلامی معاشرے میں جو مذہب پر یقین نہیں رکھتے انہیں اپنے خیالات کے پرچار اور اس پر عمل درآمد کے لیے بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں جب کہ تبلیغی اجتماعات، دینی مجالس، محافل، سڑکوں چوراہوں ہر مذہبی بحث، مساجد کی تعمیر، عبادات، خواتین میں حجاب کی مقبولیت اور صدقہ خیرات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا معاشرہ بری طرح اخلاقی انحطاط کا شکار ہے۔ آزاد خیال سوچ کو ان کی سوچ پر قدغن کی شکائت ہے جب کہ ہمارے علماء کرام بے راہ روی کا ذمہ دار آزاد خیال سوچ کو ہی سمجھتے ہیں۔ اللہ کو ایک ماننا، آخرت پر یقین رکھنا اور حیات بعد از موت پر ایمان تمام مسائل کا حل ہے، نیکی کے پرچار، اسلامی پیغام اور رسول کی سنت عام کرنے اور لوگوں کی دل و دماغ کو اس پیغام سے اجالنے اور ان کی زندگیوں میں شرعی تعلیم کے (حقیقی معنوں میں) نفاذ میں کیا رکاوٹ ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی رکاوٹ میں ہماری خود کی تشہیری خواہش رکاوٹ ہو، ہو سکتا ہے، حقیقی دینداری میں پارسائی اور تقوے کی شہرت کا تڑکہ نہ ہو، اس راہ پر چلنے کے لیے بڑی کٹھنائیاں ہوں، لیکن معاشرے کو ایک اسلام اور ایک اللہ کے پیغام کے ذریعے انسانیت کی تعلیم ضرور دی جا سکتی ہے، جو ایک اللہ، ایک رسول اور ایک قرآن کا درس ہے۔ انسانیت کی تعلیم میں ہی فلاح ہے۔

اس کے پردے سے ہی نکلیں گے خدا و اہرمن — دیکھ لینا تم جو انساں کو کبھی سمجھا گیا

میرا احمد نوید

❁❁❁

یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

م م محمودؔ

ابھی تلک بھی نقشِ پا ہے نقش اِس کا چاند پر
جو کر رہا ہے ماہتاب سے ورے نیا سفر
رُبوٹ سے یہ کر چکا ہے سر مریخ کا نگر
نہ جانے جائے آدمی یہاں سے اب کہاں کدھر
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

قریب کو بھلا دیا، گیا ہے جب سے دور تر
نظر پڑی تھی چاند سے زمیں کی اِک جدار پر
مگر مریخ سے نہ پا سکا زمیں کی کچھ خبر
ملال ہے مجھے یہی نہ آیا کچھ اِدھر نظر
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

بتا رہا ہوں تجھ کو کیا بگوشِ ہوش سن ذرا
تجھے نظر یہ آئے گا کرے جو چشمِ دل کو وا
ضرور تُو مریخ پر شجر لگا مکاں بنا
خبر زمین کی بھی رکھ پڑا ہے یاں فساد کیا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

غریب کو غریب سے غریب تر ہے کر دیا
تو جو امیر تھا یہاں امیر تر وہ ہو گیا
ہے مفلسی نے بھوک کو یہاں جنم دیا ہوا
شکم کی آگ نے خودی کو نفس کی بھسم کیا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

کسی کو عشقِ سلطنت کسی کو اقتدار کا
جو راج پا چکا اُسے ہے شوق بار بار کا
کسی نے پا لیا مزا یہاں پہ لوٹ مار کا
کوئی ہنوز منتظر ہے مالِ بے شمار کا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

تھی امن و آشتی جہاں، اُدھم وہاں مچا ہوا
چہار سُو قتال اور جدال ہے بپا ہوا
کہیں پہ گولیاں چلیں، کہیں ہے بم پھٹا ہوا
تو کوئی ایٹموں کے خبط میں ہی بس پڑا ہوا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر اِدھر

بھی کُشت و خون ہے اُدھر بھی قتل ہے روا
بشر ہی اب بشر پہ تیغ اور تبر چلا رہا
زمینِ سبز کو یہ سرخ کر کے سرخرو ہوا
وہ خونِ دل جو سرخ تھا سفید اب وہ ہو گیا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

اے آدمی، تُو یاد رکھ، ہیں قدرتیں خدا کو سب
وہ آئے گا اُتر کے آسمان سے زمیں پہ جب
انانیت، رعونتیں، گھمنڈ جن پہ تجھ کو اب
تو ہوں گی جاہ و حشم اور یہ شوکتیں بے سود تب
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

اے آدمی، فلک پہ تُو بنا ضرور آشیاں
مکینِ ارض کو کِیا ہے کیوں مکاں سے لامکاں
نہال تُو کچل رہا، مُسل رہا ہے گُل یہاں
سو، الحفیظ الاماں! کِھلائے گا جو گُل وہاں
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

مریخ کیا، تُو مشتری زحَل کی بھی غبار لا
مگر زمیں کی خاک پر گرا نفر گلے لگا
اسے عزیز رکھ، مَقام دے، تُو محترم بنا
کہ خاک پر گرا ہوا ہے گوہرِ گراں بہا
یہ آدمی عجیب ہے، عجیب بھی ہے کس قدر

تاریخ کے جھروکوں سے

ظفراللہ خان کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں

تحریر: محی الدین عباسی

چودھری ظفراللہ خان کو پنجاب کونسل کے انتخاب اور کامیابی کے دوران جو حالات پیش آئے آپ نے اپنی کتاب تحدیثِ نعمت میں بیان کیا ہے علاوہ ازیں اس کامیابی کے بعد آپ کی سیاسی قد و قامت میں بیش بہا اضافہ ہوتا چلا گیا اور آپ ایک عالمی سطح کے لیڈر کے طور پر تاریخ کا حصہ بن گئے۔ بقول چودھری جہان خان صاحب ''ظفراللہ خان کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں'' اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں حصہ لینے کی تیاری: ۱۹۲۶ء کے اگست میں والد صاحب ڈسکہ میں تشریف فرما تھے کہ ان کی طبیعت پھر ناساز ہوگئی۔ اس سال بھی مجالسِ قانون ساز کے انتخابات ہونے والے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں چودھری سر شہاب الدین صاحب ضلع سیالکوٹ کے حلقے سے چودھری جہان خاں صاحب گورایہ کے مقابلے میں پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے اور بعد میں کونسل کی صدارت پر فائز ہوئے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ ضلع سیالکوٹ سے بھی امیدوار ہوں اور ضلع گورداسپور سے بھی۔ اور دونوں حلقوں میں کامیاب ہوجانے کی صورت میں ایک نشست خالی کر دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے پھر امام جماعت احمدیہ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا جس میں علاوہ دیگر امور کے یہ بھی ذکر کیا کہ ظفراللہ خاں کو کچھ نہ کچھ فائدہ مجھ سے پہنچتا رہتا ہے۔ حضرت نے خاکسار کو قادیان طلب فرمایا۔ حاضرِ خدمت ہونے پر چودھری صاحب کا عریضہ پڑھنے کے لئے دیا اور دریافت فرمایا کہ اگر چودھری صاحب تم سے رنجیدہ خاطر ہوں تو تم کس قدر مالی فائدے سے محروم ہو جاؤ گے خاکسار نے عرض کیا کہ انڈین کیسیز کے دفتر سے جو کام بھیجا جاتا ہے اس سے چند سو روپے ماہوار کی آمد ہو جاتی ہے۔ لیکن رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ چودھری صاحب ہمیشہ خاکسار کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے ہیں اس لئے خاکسار ان کا ممنون ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار ان کا کسی رنگ میں محتاج نہیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا۔ چودھری صاحب نے ۱۹۲۳ء میں پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ ضلع سیالکوٹ سے انتخاب کے لئے امیدوار نہیں ہوں گے۔ اس الیکشن میں ان کا ارادہ ضلع گورداسپور سے امیدوار ہونے کا بھی ہے۔ اس حلقے میں ہم ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں اور ممکن ہے یہاں سے وہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہو جائیں۔ لیکن ضلع سیالکوٹ کے متعلق انہیں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے۔ فرمایا کہ انہیں یہ جواب لکھنے سے پہلے میں چاہتا تھا کہ تم سے بھی دریافت کرلوں۔ لاہور واپس آنے کے بعد جب انڈین کیسیز کے دفتر سے مجھے کچھ کام بھیجا گیا تو میں نے واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ آئندہ مجھے کام نہ بھیجا کریں۔ دوسرے دن چودھری جہان خان صاحب میرے مکان پر تشریف لائے اور دریافت فرمایا ظفراللہ خان کیا وجہ ہوئی تم نے انڈین کیسیز کے کام کے متعلق کہلا بھیجا ہے کہ آئندہ تمہیں نہ بھیجا جائے۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہوں آپ ڈرائیور کو ارشاد فرمائیں کہ کار نہر کے کنارے لے چلے وہاں میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب عرض کر دوں گا لیکن اگر آپ نے کچھ فرمانا ہو تو میرا جواب سُن لینے کے بعد فرمائیں۔ مسکرا کر فرمایا بہت اچھا۔ میں نے ان کے اس خط کا ذکر کیا جو انہوں نے حضرت صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور کہا کہ اس میں آپ نے فرمایا کہ مجھے آپ سے فائدہ پہنچتا رہتا ہے اس بات سے مجھے کوئی رنج تو نہیں ہوا کیونکہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ امر واقعہ ہے لیکن آپ کے اس فقرے نے میرے ذہن میں خیالات کی ایک رُو جاری کر دی۔ انسان کا اندازہ اپنی ذات کے متعلق صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ میرا اندازہ اپنے متعلق یہ ہے کہ میں حتی الوسع حفظِ مراتب کا خیال رکھتا ہوں اور جس شخص کو اللہ نے جس مقام پر کھڑا کیا ہو اس کے کچھ واجبات مجھ پر عاید ہوتے ہیں انہیں مناسب طور پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مثلاً سر شادی لال چیف جسٹس ہیں۔ بہت سے امور میں مجھے ان کے طرز و طریق سے اختلاف ہے۔ ان کی بعض کمزوریاں تو آشکار ہیں۔ میں ان کی عدالت میں پریکٹس کرتا ہوں۔ سال میں اوسطاً ایک مرتبہ میں چند منٹوں کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ ممکن ہے ان کو اس سے حیرت بھی ہوتی ہو کہ میں نہ ان کی خوشامد کرتا ہوں نہ کوئی غرض پیش کرتا ہوں۔ لیکن میں کسی خوف یا طمع کی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔ میرے دل میں کسی انسان کا خوف ہے نہ کسی سے کوئی طمع ہے۔ آپ میرے بچپن سے میرے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور آپ کا ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے آپ سے فائدہ پہنچنے سے متعلق جو کچھ لکھا اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں خود اپنا امتحان کرلوں کہ کیا جیسے میں سمجھتا ہوں میرے دل میں آپ کا احترام آپ کے گذشتہ حسنِ سلوک کی وجہ سے اور والد صاحب کے دوست ہونے کی وجہ سے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جسے میں احترام سمجھتا ہوں اس کی حقیقت آئندہ کے طمع کی خاطر خوشامد کی ہے۔ میں نے انڈین کیسیز کا کام اس لئے بند کر دیا ہے کہ جلبِ منفعت کا پہلو ہمارے تعلقات سے خارج ہو جائے۔ اگر آئندہ بھی میرے جذبات آپ کے متعلق وہی رہیں جو اب تک ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ میرا اندازہ اپنے متعلق صحیح تھا۔ اور اگر ان میں فرق آ گیا تو میں سمجھوں گا میرا نفس مجھے فریب دیتا ہے۔

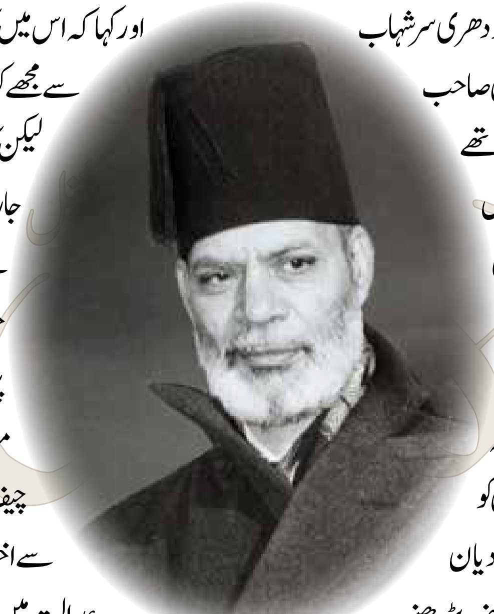

چودھری صاحب نے میری بات خاموشی سے سنی اور جب میں ختم کر چکا تو صرف اتنا فرمایا ''ظفراللہ خاں کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں۔''

جب ۱۹۲۶ء کے انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ چودھری جہان خانصاحب گورایہ کے ساتھ ہوگا۔ چودھری صاحب ضلع سیالکوٹ کے ایک خوش خلق، مہمان نواز، بارسوخ زمیندار تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے رُکن ہونے کی وجہ سے ضلع بھر کے سرکردہ زمینداروں کے ساتھ ان کا متواتر میل جول اور باہم مشورہ رہتا تھا۔ ان کے رشتہ داری اور برادری کے تعلقات بھی بہت وسیع تھے۔ ۱۹۲۳ء میں چودھری سرشہاب الدین صاحب کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے انہیں انتخاب کے سلسلہ میں معتدبہ اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے اس لئے انہیں یہ احساس ضرور ہوگا کہ انتخاب میں امیدوار کو بہت کچھ گرم سرد حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کی طبیعت اس طرف مائل تھی کہ اگر آپس میں سمجھوتے کے ساتھ کسی فیصلے کی صوت پیدا ہوجائے تو یہ طریق مناسب ہوگا۔ اس انتخاب میں اگرچہ امیدوار تو میں تھا لیکن چودھری جہان خاں صاحب جانتے تھے کہ میری تائید جس قدر ہوگی وہ میرے والد صاحب کے تعلقات اور رسوخ کی وجہ سے ہوگی۔ ضلع سیالکوٹ کے نارووال کے علاقے میں چودھری فتح الدین صاحب ذیلدار مدوکاہلوں ایک بارسوخ اور باتدبیر زمیندار تھے۔ انہوں نے کسی ملاقات کے دوران میں چودھری جہان خانصاحب سے کہا کہ انتخاب کی سردردی کی بجائے کیوں نہ کوئی صورت سمجھوتے کی اختیار کرلی جائے۔ چودھری صاحب نے فرمایا اگر آپ کے ذہن میں کوئی صورت ہو تو فرمائیں۔ چودھری فتح الدین صاحب نے کہا قرعہ اندازی سے فیصلہ کرلیا جائے۔ چودھری جہان خانصاحب نے فرمایا مناسب ہے۔ لیکن قرعہ اندازی ڈپٹی کمشنر صاحب کریں۔ چودھری فتح الدین صاحب نے جواب میں کہا کہ اس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد چودھری فتح الدین صاحب نے والد صاحب سے کہا۔ میں نے چودھری جہان خانصاحب کو قرعہ اندازی پر رضامند کرلیا ہے آپ بھی رضامندی دیدیں والد صاحب فرمایا مجھے تو یہ طریق پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ آپ چودھری جہان خاں صاحب کو اس طریق پر آمادہ کرچکے ہیں اور میرے انکار کردینے سے آپ کی سبکی ہوگی اس لئے میں بھی رضامندی دے دیتا ہوں۔ چنانچہ والد صاحب نے خاکسار کو ارشاد فرمایا کہ چودھری جہان خاں صاحب کے ساتھ ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس جاکر قرعہ اندازی کرلو۔ میں نے جب مسٹر ہرن ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں کو اپنے بنگلے پر بُلوایا دو دیاسلائی کی ڈبیہ خالی کرکے ایک میں میرے نام کا پُرزہ ڈال دیا اور دوسری میں چودھری جہان خاں صاحب کے نام کا۔ اپنے جمعدار اردلی سے کہا ان میں سے ایک اٹھالو اور اس میں جو پرزہ ہے وہ نکالو جو پرزہ جمعدار نے نکالا اس پر میرا نام تھا لہٰذا چودھری جہان خاں صاحب انتخاب سے دستکش ہوگئے۔

اس کے تھوڑا عرصہ بعد والد صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی حرارت کے ساتھ کھانسی رہنے لگی۔ والدہ صاحبہ کے اطلاع دینے پر میں ڈسکے گیا اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو لاہور لے آیا ڈاکٹر محمد یوسف صاحب نے معائنہ کیا اور WET PLURESY تشخیص کیا۔ بہت توجہ سے علاج کرتے رہے فجزاھا اللہ احسن الجزاء۔ کچھ دن بعد پھیپھڑے سے پانی نکالا جس سے بفضل اللہ کچھ افاقہ ہوا لیکن پھر تکلیف بڑھنا شروع ہوگئی۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کو بعض فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں شملے کا سفر پیش آ گیا۔ ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر یار محمد خانصاب علاج کرتے رہے۔ دو تین دن بعد پھر پانی نکالنے کی تجویز ہوئی۔ لیکن اب کی بار بجائے افاقے کے کمزوری بڑھنا شروع ہوگئی۔ ۳۱ر اگست منگل وار کی صبح کو بعد نماز فجر والدہ صاحبہ نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا خواب کی تعبیر واضح تھی اور والدہ صاحبہ نے بھی یہی تعبیر بتائی کہ تمہارے والد جمعہ کا دن شروع ہوتے ہی فوت ہوجائیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ ابھی سے سب تیاری کرلی جائے۔ چنانچہ تفصیلی ہدایات دیں جن کی تعمیل کردی گئی۔ یہ دن ہم سب کے لئے سبق آموز بھی تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم کے نشانات کے ظاہر کرنے والے بھی تھے۔ دل درد سے پُر بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر کلیۃً راضی بھی تھا۔ کچھ تفصیل ان ایام کی میری کتاب ''میری والدہ'' میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور مجھے ہمت بھی نہیں پڑتی۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں کامیابی: والد صاحب کی وفات کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ چودھری اکبر علی خاں صاحب سکنہ کوٹلی نوناں تحصیل ڈسکہ انتخاب میں امیدوار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پہلے تو میں نے اس اطلاع کو باور نہ کیا۔ چودھری صاحب کے میرے ساتھ خاندانی اور ذاتی بہت دوستانہ تعلقات تھے اور وہ میرے معاونین میں سے تھے بیشک ان کی طبیعت مزاح کی طرف مائل تھی لیکن یہ معاملہ سنجیدہ تھا اور بہرصورت انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کا موقف یہ ہے کہ قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا کہ کون امیدوار ہو درست نہیں اور رائے دہندگان کو اپنی رائے کے اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انہیں کامیابی کی توقع نہیں وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ میرا انتخاب ہی مناسب ہوگا لیکن قرعہ اندازی کے طریق کو پسند نہ کرتے تھے۔ اصولاً تو ان کا موقف درست تھا اور جب وہ انتخاب میں حصہ لینے پر مصر تھے تو انہیں باز رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ وقت آنے پر انہوں نے درخواست دیدی۔ اس لئے انتخاب کی کارروائی لازم ہوگئی اور ہمیں انتخاب کا بکھیڑا جھیلنا پڑا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ضلع سیالکوٹ کے سرکردہ زمیندار اصحاب کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات مضبوط ہوگئے۔ انتخاب کی بھاگ دوڑ کے سلسلہ میں ایک لطیفے کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ماجرہ کلاں کے ''سفید پوش'' چودھری جہان خاں صاحب نے خواہش کی کہ میں ان کے ہمراہ ان کے گاؤں جاکر وہاں کے رائے دہندگان سے ملوں۔ چنانچہ ایک شام میں اور چودھری قاسم علی خاں صاحب ذیلدار ان کے ہمراہ ان کے گاؤں گئے اور رات ان کے ہاں مہمان رہے۔ دوسری صبح انہوں نے دیہہ کے مالکان کو اپنے دیوان خانے میں بلالیا اور میرا ان سے تعارف کرایا اور میرے آنے کی غرض بیان کی اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ میز بان نے فرمایا تمہارا وقت قیمتی ہے ناشتہ کرلیں گفتگو جاری رہے گی ناشتہ ختم ہوا تو مالکان دیہہ میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے حاضرین سے کہا ''بھائیو میں تو کہتا ہوں پرچی (ووٹ) اسی چودھری کو دینی چاہیئے''۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ رائے تو ہماری بھی یہی ہے لیکن تمہارے مشورے کی کوئی خاص وجہ ہے اس نے کہا ''وجہ یہ ہے کہ ہم سب زمیندار ہیں اور جب ہمیں بیل خرید نا ہوتا ہے تو علاوہ اور باتوں کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بیل چرنے (کھانے)

میں کیسا ہے جو بیل اچھی طرح چرتا ہے وہ کلبہ رانی بھی خوب کرتا ہے۔ میں اس چودھری کو کھاتے دیکھتا رہا ہوں یہ چرتا خوب ہے چلے گا بھی خوب"۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور ہنستے ہنستے محفل برخاست ہوئی۔ چودھری اکبر علی صاحب صرف اتنا دعا کرتے تھے کہ ان کی ضمانت ضبط نہیں ہوگی۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو اس کے برعکس ان کی تائید میں آراء کی اس قدر کمی رہی کہ ان کا زرِ ضمانت ضبط ہو گیا۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ ۲۲۷ تا ۲۳۱)

علاوہ ازیں اس کامیابی کے بعد آپ نے برصغیر ہندو پاک اور عالمی سطح پر جو خدمات سرانجام دیں ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن مختصراً ذکر کر دیتا ہوں۔ تحدیثِ نعمت میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ قائداعظم نے ۱۹۲۹ء دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کے جواب میں ۱۴ نکات پیش کئے جو کہ تحریکِ پاکستان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں ایک علیحدہ مملکت ریاست کا ذکر قابلِ ستائش ہے۔ جو بعد میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان لاہور میں پیش کی گئی تھی۔ اور ۲ مارچ کو مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ پاس کی گئی تھی۔ آپ نے اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے اقوامِ متحدہ میں بھرپور آواز اٹھائی اور ان کو آزادی دلوائی۔ کشمیر کے حوالے سے قضیہ کشمیر کا اقوامِ متحدہ کی مجلسِ امن میں بھرپور کیس لڑا اور ان کے حق میں ایک قرار داد پاس کروائی۔ آج بھی پاکستانی حکومت اسی حوالے سے ہر سال اقوام متحدہ کے اجلاس میں اس کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ آپ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں بطور نمائندہ پاکستان پیش ہوتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں اقوام متحدہ کے ۱۷ویں سالانہ اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اس کے علاوہ اقوامِ متحدہ کی اسمبلی کے ایک خاص اجلاس کی بھی آپ نے صدارت فرمائی یہ جون ۱۹۶۳ء میں طلب کیا گیا تھا اور یہ چوتھا خاص اجلاس تھا جو ایک مسئلہ پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ سابق وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تجویز تھی کہ میں پاکستان کے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ کا منصب سنبھالوں یا وزارتِ دفاع یا امورِ خارجہ۔ لیکن قائداعظم چاہتے ہیں کہ وزارتِ خارجہ کا قلمدان سنبھالوں لہٰذا قائداعظم کی خواہش پر آپ کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا اور آپ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء تک اس منصب پر قائم رہے۔ مزید براں آپ کو ۱۹۷۰ء میں عالمی عدالتِ انصاف (ہیگ ہالینڈ) کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور آپ کئی سال اس عدالت میں بطور جج بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

چودھری صاحب فرماتے ہیں۔

نیست از فضل و عطائے او بعید — کور باشد ہر کہ از انکار دید

قادر است وخالق وربّ مجید — ہر چہ خواہد مے کند عجزش کہ دید؟

اس کی قدرتوں کی انتہا نہیں۔ اس انتخاب سے ۳۶ سال قبل میری والدہ صاحبہ مرحومہ نے ایک مبشر خواب دیکھا تھا جو ان کی وفات کے ۳۲ سال بعد اس انتخاب سے پورا ہوا۔ فالحمد للہ۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ ۷۰۰)

❁❁❁

Lahore International Magazine

@lahoreintl

@lahoreintl

lahoreinternational

lahoreinternational

lahoreintl

+447940077825

+447940077825

lahoreintlondon@gmail.com

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی، ......ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند نا پسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

شعبہ پاکستان

مولوی اور مدارس

الزامات اور تدارک

تحریر: کامران کامران

وقت کرتا ہے پرورش برسوں　　　حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ مذہبی مولوی حضرات اور مدارس بدفعلی کے مرتکب پائے گئے ہیں تو کیا ہوا؟ اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، جیلیں اور اسپتال وغیرہ تو اس سے کہیں زیادہ جنسی جرائم میں ملوث رہے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اس طرح کے یا اس سے بھی سنگین جرائم دنیا بھر میں عام ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ دوسرے مذہبی اداروں جیسے چرچ، مندر، پگوڈا وغیرہ میں بھی اس طرح کے جرائم کی شرح مدارس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ علماء کو بدنام کرنے کیلئے کفار کی فقط سازشیں ہی

ہیں۔ جرم ہر حال میں جرم ہی ہے۔ اور مجرم کو قرار واقعی سزا ملنی ہی چاہئے اگرچہ وہ مدارس کا منتظم یا مذہبی مولوی ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا بھر میں ان جرائم کے تدارک کا حل پیش کرنا میری ذمہ داری نہیں ہے اس لئے میں صرف مدارس اور مذہبی مولوی حضرات کے معاملات کے تجزیے تک ہی خود کو محدود رکھتا ہوں۔

اللہ تعالی نے جب اپنے دین کو انبیاء کرام کے توسط سے دنیا میں متعارف کرایا تو تبلیغ دین کا پہلا اصول ہی یہ طے کیا تھا کہ دین کی تبلیغ، تعلیم، تلقین یا تدریس وغیرہ میں سے کسی بھی کام کے عوض اجرت نہیں لی جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ انبیاء کرام، ان کے پیروکاروں اور طویل ادوار تک انبیاء کرام کے دین کو آگے پہنچانے والوں میں سے کسی نے بھی کبھی اجرت نہیں لی۔ یہ اجرت نہ لینے کا معاملہ ایک بہت ہی زبردست حکمت عملی کے تحت اختیار کیا گیا تھا۔

عام طور پر جب کسی کام کی اجرت لی جاتی ہے تو وہ کام آپ کی مجبوری، ضرورت معاش یا جو بھی ہو لیکن اکثر اس میں ذوق وشوق، لگن اور دلچسپی کا عمل دخل نہیں ہوتا (استثنیٰ اپنی جگہ)۔ اور جو کام اپنے ذوق وشوق، لگن، دلچسپی اور رضا کارانہ طور پر کیا جاتا ہے اسکی کبھی بھی اجرت نہیں لی جاتی یعنی اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ انسان دین کے کام کو انہماک، توجہ، ذوق وشوق، دلچسپی، لگن اور رضا کارانہ طور پر کرے نہ کہ اس کو روزگار ہی بنا لے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے لاکھوں پیشہ ور مولوی صاحبان وہ معاشرتی اثرات پیدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے جو چند سو صحابہ کرام نے عملی طور پر پیدا کر کے دکھا دئے تھے۔ دین کو پیشہ بنا لئے جانے کے بہت سارے نقصانات میں سے چند نقصان یہ ہوئے کہ مولوی صاحبان ذرا سی اجرت کی وجہ سے حق بات کہنے سے محروم رہ گئے، انہیں امیر آجروں کی باتیں ماننا پڑ گئیں، ان میں دین پر عمل کا ذوق وشوق باقی نہ رہا جس کی وجہ سے ان کا کردار انتہائی خراب ہو گیا، ان پر کئی جرائم خصوصاً بدفعلی کے سنگین الزامات ثابت ہو گئے، انکی معاشرتی وقعت بہت کم ہو گئی، ان کا سیاسی اثر ورسوخ ناپید ہوتا چلا گیا۔ کبھی پندرہ گھنٹے کی جاب کے بعد درس نظامی کی کلاسز اٹینڈ کرنے والے کو نظر اٹھا کر تو دیکھئے۔ کبھی تجارت کی مصروفیت میں سے وقت نکال کر نماز پڑھانے والے کو تو دھیان میں لائیے۔ کبھی کیمیا لیب میں ریسرچ کرنے والے پروفیسر کا آذان دینے کیلئے جلدی جلدی مسجد پہنچنے کو تو تصور کیجئے۔ کبھی سرجری کرنے والے سرجن کا وقت نکال کر تفہیم قرآن پر درس دینے کا خیال تو دل میں لائیے۔ کبھی میرین انجینئر کا سمندری سفر کے دوران لکھے جانے والے فتاویٰ کی کتاب خریدنے کیلئے دھوپ میں لمبی لائن لگانے پر تو غور کیجئے۔ کبھی ملازمت کی سخت مصروفیت کے دوران ملحدوں کے اعتراضات کے جوابات لکھنے والے عام سے شخص کے مضامین اور تحریروں کو سمجھنے کی کوشش تو کیجئے۔ یہ سب آج کے دور کے لحاظ سے آئیڈیل ہی سہی لیکن ماضی میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ امام ابوحنیفہ پیشہ ور امام نہیں بلکہ کپڑے کے مصروف تاجر تھے جو اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر

اجتہاد کرنا سکھایا کرتے تھے۔

آج کل کی تبلیغی جماعت اپنے کارکنوں کو یہ کہہ دیں کہ نفل پڑھنا ضروری نہیں تو کارکن صاحبان دھڑلے سے فرض نمازوں کے نفل پڑھنے کے حصے میں فالتو بیٹھ کر وقت ضائع کر دیں گے لیکن نفل نہیں پڑھیں گے۔ جبکہ پہلے کے لوگ تو تلواروں کے سائے میں بھی نفل پڑھنے سے رک نہیں پاتے تھے۔ یہ فرق ہوتا ہے مجبوری میں دین اپنانے اور ذوق وشوق سے دین اپنانے میں۔ اب ایسے پیشہ ور مذہبی لوگ ذرا سی اشتہاء پر گناہ میں ملوث نہیں ہوں گے تو اور کیا کریں گے؟ بدفعلی کے مرتکب نہیں ہوں گے تو اور کیا کریں؟ اگر انہی لوگوں نے غیر پیشہ وارانہ طور پر جذبے کے تحت دین کو اپنایا ہوتا تو دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی بھی ان کو ترغیب اور تحریص دینے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ناکام ہوجاتی۔ الغرض پیشہ ورانہ طور پر دین کو اپنانے میں بہت سے نقصانات اور مسائل ہیں جبکہ غیر پیشہ ورانہ طور پر دین کو اپنانا بہت سارے فوائد اور غیر معمولی ایڈوانٹیجز رکھتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس معاملے کو ذکر کیا ہے کہ دین کے معاملے میں اجرت لینا ناپسندیدہ عمل ہے۔

اب ذرا دین کے معاملے میں اجرت نہ لینے کے فوائد اور حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۱) جب دین کو غیر پیشہ وارانہ طور پر دلی انہماک کے ساتھ اپنایا جاتا ہے تو ہر طرح کے غیر مذہبی جرائم، اخلاقی اور معاشرتی بداخلاقیاں، یہاں تک انسانی رویوں میں نارمل سمجھے جانے والی برائیاں بھی، اس مذہبی شخص کے قریب نہیں آتیں۔

(۲) جب دین کو غیر پیشہ وارانہ طور پر اختیار کیا جائے گا تو دین میں فرقہ وارانہ اختلافات اصولی طور پر پیدا ہی نہیں ہوسکیں گے۔ فرقے پیدا ہونے کے تین عمومی اسباب ہوتے ہیں، یا تو

(الف) سازش کے تحت پیدا کیے جاتے ہیں یا پھر لوگوں کی

(ب) غیر ذمہ داری اور

(پ) نالائقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ جب انہماک سے دین کو قبول کریں گے تو وہ کبھی بھی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کریں گے اور صرف اپنی لیاقت کے مطابق فیصلہ کریں گے جس کی وجہ سے نالائقی کا در بند ہوجائے گا۔ رہی بات سازشوں کی تو وہ یا تو وقت گزرنے پر اپنی موت آپ مرجائیں گی یا اگر وہ سازشی فرقے امت میں باقی رہے بھی تو انتہائی غیر موثر ہو کر رہ جائیں گے البتہ بعض حالات کی استثناء اپنی جگہ ہے۔ میں ان تینوں فرقہ وارانہ معاملات کی امت مسلمہ کے ماضی کے تناظر میں مثال پیش کرتا ہوں۔

(الف) سازش عناصر کی بیخ کنی کی مثال: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ذوالخویصرہ نے ایک فرقہ پیدا کر دیا تھا۔ پہلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے مکالمے کے لیے کئی صحابہ کرام کو بھیجا، بعد ازاں خارجیوں کی ہٹ دھرمی بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انکے خلاف جنگ کر کے ان کو بری طرح پسپا کر دیا۔

(ب) ذمہ داری کی مثال: جب امت مسلمہ کو قرآن کریم فراہم کیا گیا تھا تو اس پر اعراب، نقطے، علامتیں اور روقوفات نہیں تھے صحابہ کرام اور تابعین نے انتہائی ذمہ داری کا مظاہرہ پیش کرتے ہوئے قرآن کریم پر اعراب، نقطے، علامتیں اور روقوفات ڈال دیئے تاکہ قرآن کریم کو پڑھنے میں ادنیٰ سی غلطی بھی نہ کی جاسکے۔

(پ) صرف اپنی لیاقت تک محدود رہنے کی مثال: ماضی کے علماء کا یہ ایک عمومی وطیرہ تھا کہ جس مسئلہ پر انہیں معلومات نہیں ہوتی تھی وہ اس مسئلہ کا حل معلوم کرنے کے لیے لوگوں کو دوسرے علماء کی طرف بھیج دیا کرتے تھے۔ جیسے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے ایک مسئلہ معلوم کروانے کے لیے ایک شخص کو حضرت عبد الرحمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا۔

(۳) غیر پیشہ ورانہ انداز سے دین کو اپنانے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دین کی غیر معمولی باتیں اور حکمتیں مختلف زاویوں سے سمجھ میں آنا شروع ہوجاتی ہیں مثلاً جب ایک ڈاکٹر عالم دین بھی ہو تو وہ قرآن کریم کی تفسیر لکھتے وقت قرآن کریم میں موجود میڈیکل کے انکشافات کو زیادہ بہتر اور نمایاں طور پر واضح کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح ایک انجینئر جب عالم دین بھی ہو تو وہ بھی تفسیر لکھنے کے دوران انجینئرنگ سے متعلق قرآن کریم کی باتوں کو زیادہ وضاحت سے بیان کر سکے گا۔ اسی طرح کوسموس، جغرافیہ، ایمبریالوجی اور دوسرے ماہرین بھی قرآن وحدیث کی وہ حکمتیں جو عام لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتی ہیں، نمایاں کر کے لوگوں کو سامنے پیش کر دیں گے۔

(۴) وقت گزرنے کے ساتھ ادیان میں فرقے، سازشی نظریات اور غیر دینی اختلافات کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر لوگوں نے غیر پیشہ وارانہ طور پر دین کو اپنایا ہوتا ہے تو وہ ایسے معاملات کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں لیکن فرقوں، سازشوں اور غیر دینی اختلافات کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ مثال کے طور پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو چار دانگ پھیلی ہوئی اسلامی سلطنت کے خلیفہ نے ایک مخصوص فرقہ وارانہ فتویٰ حاصل کرنے کے لئے بہت مجبور کیا، برسوں تک انہیں قید وبند کی سختیوں میں رکھا گیا، برسوں تک انہیں مسلسل کوڑے مارے گئے لیکن امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے وہ فتویٰ نہیں دیا۔

(۵) وقت گزرنے کے ساتھ ادیان میں کچھ ایسے تکنیکی مسائل اور معاملات پیدا ہوتے ہیں کہ جن کیلئے اجتہاد اور فقہی استنباط کی ضرورت پیش آتی ہے۔ غیر پیشہ ور عالم تو اس صورتحال کا ادراک کر کے اجتہاد اور استنباط کی ضرورت کو کماحقہ پورا کر دیتا ہے لیکن پیشہ ور عالم اس صورتحال کا ادراک نہ کرتے ہوئے بعض اوقات غیر ضروری جمود پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے جس کی وجہ سے دین کی روح کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے فوائد تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن طول کلام کی وجہ سے ان ہی پوائنٹس پر اکتفا کیا ہے۔ ❁❁❁

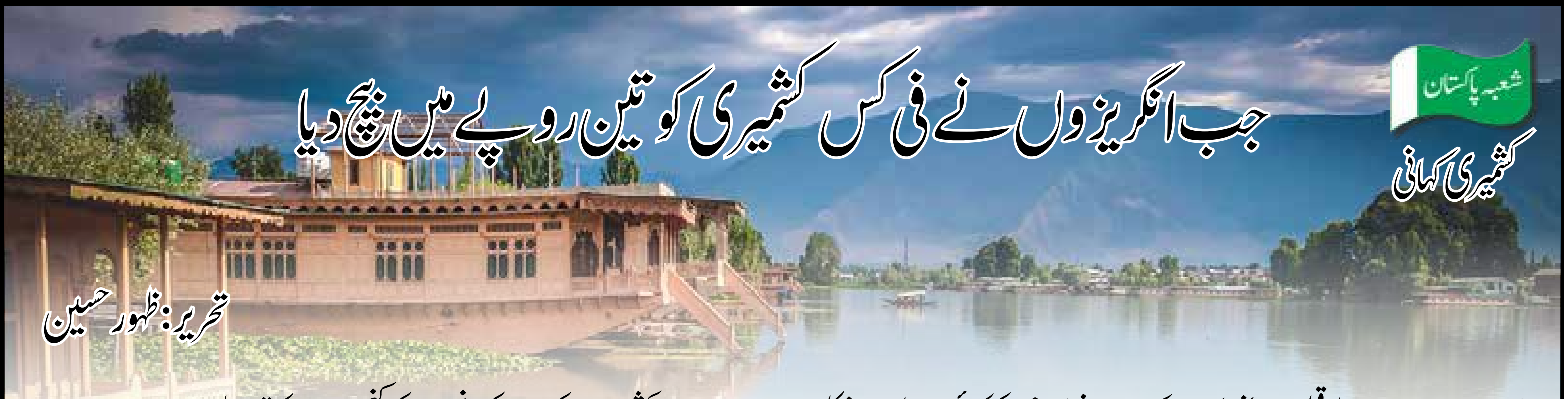

شعبہ پاکستان

کشمیری کہانی

جب انگریزوں نے فی کس کشمیری کو تین روپے میں بیچ دیا

تحریر: ظہور حسین

آج سے پونے دوسو سال قبل تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ پیش آیا جس کی کوئی اور مثال ملنا مشکل ہے۔ ۱۸۴۶ کو ایک ملک اپنی زمین، پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں، چرندوں، پرندوں اور انسانی آبادی کے ساتھ بیچ دیا گیا۔

یہ ملک کشمیر تھا (اس زمانے میں یہ خطہ آزاد ملک کی حیثیت رکھتا تھا) اور اس بد نامِ زمانہ معاہدے کو بیعہ نامہ امرتسر کہتے ہیں جس کے تحت ۷۵ لاکھ روپے کے عوض انگریزوں نے کشمیر کی ۲۵ لاکھ آبادی (تین روپیہ فی کس) اور دو لاکھ ۱۸ ہزار مربع کلومیٹر رقبے کو جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اسی واقعے کے بعد کشمیر پر ڈوگرہ راج قائم ہوا۔ ایک تخمینے کے مطابق اس وقت کے ۷۵ لاکھ نانک شاہی اس دور کے ۵۵ ہزار برطانوی پاؤنڈ کے لگ بھگ تھے، جو آج کے ساڑھے چھ کروڑ پاؤنڈ بنتے ہیں۔ اگر اس رقم کو آج کے پاکستانی روپوں میں منتقل کیا جائے تو آج کے سوا ۱۴ ارب پاکستانی روپوں کے برابر رقم بنتی ہے، گویا تقریباً ۶۵ ہزار پاکستانی روپے فی مربع کلومیٹر کے نرخ سے پورے کشمیر کا سودا ہوا۔ اس معاہدے کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۹۴۶ کو کشمیر کے قد آور سیاسی رہنما شیخ محمد عبداللہ نے برصغیر کی بدلتی صورت حال اور دوسری جنگ عظیم سے برطانیہ کے عالمی اقتدار پر پڑنے والے منفی اثرات کو بھانپتے ہوئے کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع کر دی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ تیز کر دیا نیز کشمیری عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے جلسے جلوسوں کا بڑے پیمانے پر اہتمام کرنا شروع کر دیا۔

ایک جلسہ سری نگر کے زیندار محلہ حبہ کدل میں منعقد کیا گیا جس میں شیخ عبداللہ نے ایک جوشیلی اور جذباتی تقریر کی جس کے نتیجے میں پورے کشمیر میں جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ تقریر میں انہوں نے کہا، ہم ایک ایک روپیہ اکٹھا کر لیں گے اور اس طرح سے ۷۵ لاکھ روپے کی وہ رقم مہاراجہ ہری سنگھ کو واپس کریں گے جس کے عوض ان کے پردادا مہاراجہ گلاب سنگھ نے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے کشمیر کو خرید لیا تھا۔

بہر کیف شیخ عبداللہ کو ایک ایک روپیہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو حالات کی مجبوری کے سبب ہندوستان سے جانا پڑا اسی طرح مہاراجہ ہری سنگھ بھی چلتے بنے۔ ایک ملک دو ممالک ہو گئے، دونوں آزادی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کشمیریوں کا وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

معروف کشمیری مورخ اور شاعر ظریف احمد ظریف نے بتایا کہ بے شک سنہ ۱۹۴۷ میں پیدا ہونے والے حالات کے پیش نظر مہاراجہ ہری سنگھ کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی لیکن وہ جاتے جاتے کشمیریوں کی غلامی کی زنجیروں کی کنجی بھارت کو تھما بیٹھے۔

'ڈوگرہ راج تو ختم ہوا، لیکن افسوس کہ ہم صدیوں پرانی غلامانہ زندگی سے اب بھی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیں بار بار غلام بنایا گیا یہاں تک کہ معمولی قیمت کے عوض خرید ا گیا۔ ہمارے ذہنوں سے یہ بوجھ اترنا مشکل ہے۔ ہمارے اذہان اور قلم کبھی بھی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے، موجودہ ظالمانہ اور جابرانہ دور میں تو ہم سب مشکوک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

گلاب سنگھ کشمیر کے مالک کیسے بنے؟

لداخ سے تعلق رکھنے والے نامور مورخ عبدالغنی شیخ کے مطابق گلاب سنگھ ۱۷ اکتوبر ۱۷۹۲ کو جموں میں ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۱۰ میں وہ سکھ سلطنت کے بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بحیثیت ذاتی محافظ تعینات ہوئے۔ ۱۸۰۸ میں رنجیت سنگھ جموں کو اپنے زیر نگیں لے آئے تھے۔ ۱۸۱۹ میں ان کے جرنیل دیوان چند اور گلاب سنگھ نے کشمیر کے پٹھان گورنر جبار خان کو شکست دی اور کشمیر کو پنجاب کے ساتھ ضم کیا۔ رنجیت سنگھ اپنے جرنیل گلاب سنگھ کی فتوحات اور کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے سنہ ۱۸۲۲ میں گلاب سنگھ کو جموں جاگیر میں دیا اور راجہ کے خطاب سے نوازا۔ سنہ ۱۸۲۹ کو رنجیت سنگھ کی ہدایت پر گلاب سنگھ نے کشتواڑ پر حملہ کیا اور راجہ محمد تیغ سنگھ کو شکست دی اور کشتواڑ کو جموں کے ساتھ ملایا۔ دراصل محمد تیغ سنگھ نے سنہ ۱۸۱۵ میں کابل کے مفرور بادشاہ شجاع الملک کو پناہ دی تھی جس پر رنجیت سنگھ ناراض تھے۔

اگست ۱۸۳۴ میں رنجیت سنگھ کے ایما پر راجہ گلاب سنگھ کے جرنیل زور آور سنگھ نے لداخ پر دھاوا بولا جس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی سے باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ زور آور سنگھ نے لداخ کو جموں کے ساتھ ملایا اور یوں لداخ کی ایک ہزار سالہ خود مختار حکومت ختم ہوئی۔

عبدالغنی شیخ کے مطابق سنہ ۱۸۳۹ میں زور آور سنگھ نے بلتستان پر فوج کشی کی اور اسے مغلوب کر کے جموں کا حصہ بنایا۔ اس کے دو سال بعد یعنی سنہ ۱۸۴۱ میں زور آور سنگھ نے تبت کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا لیکن وہاں ڈوگرہ فوج کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور زور آور سنگھ مارا گیا۔ اس کے بعد گلاب سنگھ نے تبت پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی پنجاب کو اپنی سلطنت کا حصہ بنانا چاہتی تھی لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جیتے جی ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ کو رنجیت سنگھ فوت ہوئے۔ لیکن ان کی اولاد اور جانشین کمزور حکمران ثابت ہوئے۔

دو جانشین کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ ایک سال کے اندر پر اسرار طور فوت ہوئے۔ ان کے بعد شیر سنگھ تخت نشین ہوئے لیکن وہ خانہ جنگی کا شکار ہوئے اور چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ نے

کمسنی میں تخت وتاج سنبھالا۔ ۱۸۴۵ میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان لڑائیوں میں سکھ ہار گئے اور پنجاب سکھوں کے ہاتھ سے نکلنے لگا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے نوجوان کشمیری ریسرچ سکالر اور کالم نویس وارث الانور نے بتایا کہ سنہ ۱۸۰۹ کے معاہدہ امرتسر یا ٹریٹی آف فرینڈشپ کے تحت رنجیت سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک دوسرے سے نہ الجھنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھ سلطنت غیر مستحکم ہوئی اور تیزی سے زوال کی جانب گامزن ہو گئی۔ سکھ سلطنت کو سب سے بڑا دھچکہ ۱۸۴۵ اور ۱۸۴۶ میں لڑی جانے والی پہلی اینگلو سکھ جنگ میں ہزیمت آمیز شکست سے لگا اور اسے معاہدہ لاہور کے تحت ایک بڑا حصہ سرنڈر کرنا پڑا۔ جنگ میں ہار کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے پنجاب پر قابض ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ سنہ ۱۸۴۸ کی دوسری اینگلو سکھ جنگ میں انگریز پنجاب پر مکمل اختیار کے ساتھ قابض ہو گئے اور یوں پنجاب سے سکھ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

نوجوان کشمیری محقق ڈاکٹر سہیل الرحمان لون کہتے ہیں کہ ماضی میں جب دو ممالک کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں تو جیتنے والے ملک کے اخراجات جنگ کا معاوضہ ہارنے والے ملک کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

سکھ سلطنت کو جنگ ہارنے پر نو مارچ ۱۸۴۶ کے معاہدہ لاہور کی رو سے انگریزوں کو ڈیڑھ کروڑ روپے ادا کرنے تھے۔ اس کے خزانے میں صرف ۵۰ لاکھ روپے تھے۔ باقی ایک کروڑ روپے کے عوض اس نے دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان آنے والے علاقے بشمول کشمیر اور ہزارہ کے صوبے سرنڈر کیے۔

گلاب سنگھ نے سکھ سلطنت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان معاملات کو سلجھانے میں ثالث کا کردار ادا کیا لیکن پھر محض چھ دن بعد یعنی ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ کو معاہدہ امرتسر کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی سے کشمیر سمیت وہ مختلف علاقہ جات خریدے جو چند دن پہلے سکھ سلطنت کا حصہ تھے۔

فی کشمیری تین روپے: معاہدہ امرتسر فریڈرک کیوری اور میجر ہنری مونٹگمری لارنس کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس وقت کے گورنر جنرل سر ہنری ہارڈنگ کے حکم سے برطانوی حکومت اور بہ نفس نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ کو طے ہوا اور سر ہنری ہارڈنگ کی مہر ثبت ہو کر منظور ہوا۔

معاہدے کی دفعہ نمبر ایک میں لکھا ہے: برطانوی حکومت تمام پہاڑی علاقہ مع اس کے ملحقات کے جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع ہیں، بشمول چھمبہ بغیر لاہور، جو نو مارچ ۱۸۴۶ کے معاہدہ لاہور کی دفعہ ۶ کی رو سے لاہور کی ریاست نے برطانوی حکومت کے حوالے کیے ہیں، مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولاد نرینہ کے آزاد قبضے میں ہمیشہ کے لیے تبدیل کرتی ہے۔

معاہدہ امرتسر کی دفعہ نمبر تین میں لکھا ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے وارثوں کے نام جو علاقہ جات منتقل کیے گئے ہیں ان کے معاوضے میں وہ برطانوی حکومت کو ۷۵ لاکھ (نانک شاہی) روپے ادا کریں گے۔ ۵۰ لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ کو یا اس سے قبل۔

ظریف احمد ظریف کہتے ہیں: ایک وقت وہ تھا جب گلاب سنگھ سکھ سلطنت کے بانی رنجیت سنگھ کے ایک چہیتے فوجی افسر تھے۔ انہیں رنجیت سنگھ نے کافی اختیارات دے رکھے تھے، لیکن چونکہ وہ ایک شاطر اور لالچی انسان تھا اس نے سکھ سلطنت کے خزانے کو آہستہ آہستہ لوٹ لیا تھا۔ جموں اور دیگر کچھ علاقے پہلے سے ہی گلاب سنگھ کے پاس تھے اس کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کو کشمیر اور دیگر علاقہ جات بھی ان کے سپرد کرنے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑا۔ کشمیر کو گلاب سنگھ کے سپرد کرنے کی قیمت ۷۵ لاکھ (نانک شاہی) روپے مقرر ہوئی۔ اس وقت اس بدنصیب خطے کی آبادی ۲۵ لاکھ کے آس پاس تھی یعنی انگریزوں نے فی کس کشمیری کو تین (نانک شاہی) روپے میں فروخت کیا۔

جس وقت یہ بدنام زمانہ سودا ہوا اس وقت ایک نانک شاہی روپے کی قدر ہندوستانی ایک روپے کی نسبت صرف ۱۲ آنے تھی۔ ہندوستانی کرنسی میں حساب لگائیں تو کشمیر کو محض ۵۶ لاکھ ۲۵ ہزار روپے میں فروخت کیا گیا۔ معاہدہ امرتسر ایک مشروط معاہدہ تھا۔ معاہدے کی رو سے گلاب سنگھ کو ہر سال پشمینہ کی ۱۲ بکریاں (چھ نر اور چھ مادہ)، چھ عدد کشمیری پشمینہ شال اور ایک گھوڑا انگریزوں کو دینا پڑتا تھا۔

ظریف احمد ظریف نے بتایا کہ سکھ سلطنت کی طرح گلاب سنگھ کی تجوری بھی خالی تھی لیکن انہوں نے قرضہ اٹھا کر انگریزوں کو پہلی قسط ادا کی۔

گلاب سنگھ نے پہلی قسط کی ادائیگی کی خاطر کچھ پیسے امرتسر کے تاجروں سے ادھار لیے۔ جب پیسوں کی واپسی کا وقت آیا تو گلاب سنگھ نے ان کو پیسے واپس کرنے کی بجائے مہاراج گنج سری نگر میں ایک مارکیٹ بنا کر دیا۔

تاریخ کی چند کتابوں میں درج ہے کہ گلاب سنگھ نے پہلی قسط کی ادائیگی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سے پیسوں کی رسید مانگی۔ لیکن انگریزوں نے انہیں رسید نہیں دی۔ احتجاج کے طور پر گلاب سنگھ نے باقی ۲۵ لاکھ روپے انگریزوں کو ادا نہیں کیے۔ اس طرح گلاب سنگھ کو کشمیر محض ۵۰ لاکھ (نانک شاہی) روپے میں مل گیا۔

نامور کشمیری مورخ، محقق، نقاد اور مصنف محمد یوسف ٹینگ نے انڈپینڈنٹ اردو کو بتایا کہ طاقتور افراد کی جانب سے ممالک اور خطوں پر بزور طاقت قابض ہونے کے قصوں سے تاریخ بھری پڑی ہے لیکن ایسے واقعات کا ذکر بہت کم ملتا ہے جب نہ صرف ایک ملک بلکہ اس میں رہنے والے لوگ، ان کا مال و متاع اور سب سے بڑھ کر ان کی عزت و ناموس کو چند لاکھ سکوں کے عوض بیچا گیا ہو۔ کشمیر کا سودا جس شخص سے کیا گیا وہ ایک لالچی اور ان پڑھ انسان تھا۔ وہ ایک روپے بھی نہیں چھوڑتا تھا۔

اے باد صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئی
دہقان و کشت و جو و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

(اے بادِ صبا جنیوا کے شہر کی طرف جانا ہو تو مجلس اقوام سے میری طرف سے کہنا۔ کسان، کھیت، ندی اور باغ سب کو بیچ دیا گیا۔ ایک قوم کو بیچا گیا اور کتنے سستے داموں)

محمد یوسف ٹینگ نے شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے متذکرہ اشعار سناتے ہوئے کہا: علامہ اقبال کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کشمیر کو بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر کے تحت چند لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض گلاب سنگھ کو فروخت کیا۔

او کشتِ گُل و لالہ بہ بخشد بخرے چند

علامہ اقبال اس مصرعے میں کہتے ہیں کہ انگریزوں نے کشمیر کو چند خروں کے حوالے کر دیا۔ ان کا اشارہ گلاب سنگھ کی طرف ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کے مطابق یہ علامہ اقبال ہی تھے جنھوں نے یہاں کے لوگوں کو ڈوگرہ راج کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے ہڑتال کی اپیل کی تھی۔ اس اپیل پر پورے متحدہ ہندوستان میں ہڑتال کی گئی تھی۔ جب بھی یہاں سے کوئی لاہور جا کر علامہ اقبال سے ملاقات کرتا تھا تو وہ سب سے یہی کہتے تھے کہ کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جدوجہد ہر حال میں جاری رکھنا۔

مورخ اور شاعر ظریف احمد ظریف سے پوچھا کہ کیا علامہ اقبال کے علاوہ کسی دوسرے مقامی یا غیر مقامی شاعر نے بدنام زمانہ کشمیر کا سودا پر قلم اٹھایا ہے تو ان کا کہنا تھا: جس طرح آج بات کرنے پر غداری کی لیبل چسپاں کی جاتی ہے اسی طرح ڈوگرہ شاہی حکومت میں بھی غداری کی سزا سنگین تھی۔ علامہ اقبال کے علاوہ کسی نے بھی اس ظلم پر کھل کر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ اس وقت قلموں پر بھی نظر تھی لہٰذا کسی بھی کشمیری شاعر کے لیے اس پر کچھ لکھنا ممکن نہیں تھا۔ علامہ اقبال قومی غیرت رکھنے والی شخصیت تھے۔ سب سے بڑھ کر چونکہ وہ نسلاً کشمیری تھے لہٰذا انہیں اپنے آباواجداد کے وطن کی بہت زیادہ فکر دامن گیر تھی۔

بھارت کے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے جب جولائی-اگست ۱۹۴۷ میں کشمیر کا دورہ کیا تو انہوں نے معاہدہ امرتسر کو بکری پتر کا نام دیا اور ڈوگرہ راج کے مظالم پر شدید ناراضی ظاہر کی۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپریل ۱۹۴۷ میں ہندوستان کے دورے پر آنے والے برطانوی حکومت کے ایک کابینہ مشن کو ایک خط میں لکھا: ایک سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کشمیر کا سودا ہوا صرف ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض۔ کشمیر، اس کے عوام، اس کے سبزہ زار اور مرغزار اور اس قسم کے تمام وسائل سکھ سلطنت کے ایک باجگزار راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیے گئے۔

اس وقت کے کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے اس معاہدے کے سلسلے میں کشمیر کا سودا کرنے کی مزاحمت کی لیکن اسے برطانوی فوج کی مدد سے مطیع بنا دیا گیا۔ اس طرح سے ۱۸۴۶ کے اس بکری پترنے جس کو غلطی سے معاہدہ امرتسر کہا جاتا ہے، کشمیریوں کی قسمت پر مہر لگا دی۔ ہم اس بیعہ نامے کی اخلاقی اور سیاسی حیثیت کو چیلنج کرتے ہیں جس میں کشمیری عوام کبھی فریق نہیں رہے۔

وارث الانور کے مطابق کشمیر میں تعینات سکھ سلطنت کے گورنر شیخ امام الدین، جنھیں مقامی لوگ پسند کرتے تھے، نے گلاب سنگھ کی فوج سے جنگ کی لیکن انہیں کامیابی نہ مل سکی۔ شیخ امام الدین کی مزاحمت کو انگریزوں کی مدد سے کچلا گیا۔ امام الدین کو کمزور کرنے کے لیے ان کے مشیروں اور ساتھیوں کو جاگیر اور دیگر مراعات کا لالچ دیا گیا۔

عام کشمیری اس بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

مورخ عبد الغنی شیخ کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی اور سکھ سلطنت کے درمیان ہونے والی پہلی اینگلو سکھ جنگ کے دوران راجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کا اعتراف اس وقت کے گورنر جنرل سر ہنری ہارڈنگ نے 'خفیہ کمیٹی' کی رپورٹ میں کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل الرحمان لون کہتے ہیں: میں نے سکھ تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہاں یہ لکھا ہے کہ گلاب سنگھ نے سکھ سلطنت کو دھوکہ دیا۔ بعض کتابوں میں انہیں غدار لکھا گیا ہے۔

گلاب سنگھ نے سنہ ۱۸۴۵ اور ۱۸۴۶ کی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ وہ فوج کے ایک بڑے حصے کے سرپرست تھے۔ جب گلاب سنگھ اور ان کی فوج نے انگریزوں کے خلاف نہیں لڑا تو نتیجتاً سکھ ہار گئے۔ ڈاکٹر سہیل الرحمان لون اس دلیل کو خارج کرتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے گلاب سنگھ کو ان کی پروبرٹش سروسز کے عوض کشمیر اور دیگر علاقہ جات دے دیے۔ 'انگریز اتنے دیالو نہیں تھے کہ کسی کو خدمات کے عوض ایک بڑا خطہ دے دیتے۔ گلاب سنگھ کو کشمیر کا مالک بنانے کے معاشی اور جغرافیائی پہلو تھے۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ اس خطے پر براست حکومت کرنے سے، بہت کم آمدن ہو گی۔ ان کا خیال تھا کہ اس خطے میں فوج کی تعیناتی اور حکومتی امور چلانے پر جتنے پیسے خرچ ہوں گے آمدنی اس سے کم آئے گی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس خطے میں ایک طرف روس اور دوسری طرف افغانستان کا خطرہ درپیش تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے کشمیر کو ایک بفر سٹیٹ بنایا یعنی اگر روس یا افغانستان سے حملہ ہوتا ہے تو پہلے ان کا ٹکراؤ کشمیر کی فوج سے ہو گا۔ ڈاکٹر سہیل الرحمان لون کے مطابق کشمیر واحد ایسی پرنسلی سٹیٹ تھی جہاں ایسٹ انڈیا کا ریزیڈنٹ تعینات نہیں تھا۔

عبد الغنی شیخ کہتے ہیں کہ ۳۰ جون ۱۸۵۷ کو انتقال سے قبل مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے بیٹے اور جانشین مہاراجہ رنبیر سنگھ کے لیے ایک پٹہ (ہدایت نامہ) لکھا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ 'یہ ریاست انگریز سرکار کا تحفہ ہے جو ہمیشہ کے لیے ہماری اولاد کی ملکیت ہے۔ اس لیے یہ تمہارا اولین فرض ہے کہ تم دل و دماغ سے ان کے وفادار رہو۔

وہ مزید کہتے ہیں: مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تخت نشینی کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی لڑی گئی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔

رنبیر سنگھ نے انگریزوں کی مدد کے لیے تقریباً تین ہزار فوجی بھیجے جنھوں نے دلی کے محاصرے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں انگریز گورنر جنرل نے مہاراجہ کی خدمات کی سراہنا کی جبکہ ملکہ انگلستان نے تحفے بھیجے۔ انہیں ستارہ ہند کے اعزاز سے بھی نوازا۔

ظلم و جبر کے نئے دور کا آغاز

ظریف احمد ظریف کے مطابق گلاب سنگھ جب تک تخت نشین رہے ان سے جتنا ہوسکا انہوں نے کشمیریوں پر ظلم کیا اور سختی کی۔ جہاں بھی کہیں کوئی پیسہ نظر آیا اس کو اپنے سرکاری خزانے میں جمع کرایا۔ گلاب سنگھ کو پہلے سے ہی روپے اور مال و دولت سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر سہیل الرحمان لون کہتے ہیں کہ گلاب سنگھ نے سنہ ۱۸۴۸ میں ایک فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ کشمیر کی پوری زمین ڈوگرہ خاندان کی ملکیت ہے۔

گلاب سنگھ نے کاشتکاروں کو زمین استعمال کرنے سے نہیں روکا لیکن انہیں اتنا اناج سرکاری خزانے میں جمع کرنا پڑتا تھا کہ ان کے پاس زیادہ سے زیادہ ۲۵ فیصد اناج بچتا تھا۔ کچھ کاشتکار اناج کو زمین کے نیچے دباتے تھے اور پھر جب انہیں اطمینان ہوتا کہ پکڑے نہیں جائیں گے تو نکال لیتے تھے۔ تاہم محمد یوسف ٹینگ کے مطابق سرکاری خزانے میں ایک بڑا حصہ جمع کرنے کے بعد ڈوگرہ حکومت کے اہلکار رہی سہی اناج لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اب اگر کسی کو ٹیکس سے مستثنیٰ زمین دی جاتی تو وہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ڈوگرہ یا کشمیری ہندو پنڈت ہوتے تھے۔ کشمیری پنڈت چونکہ پڑھے لکھے تھے وہ نہ صرف ڈوگرہ حکومت کے لیے کام کرتے تھے بلکہ مخبری کا فریضہ بھی انجام دیتے۔

وارث الانور کہتے ہیں: کشمیری ہندو پنڈتوں کا محکمہ مال اور دیگر محکموں پر کنٹرول تھا یعنی پنڈت ویسے ہی ڈوگرہ حکومت کے قریبی رہے جیسے وہ آج ہیں۔

گلاب سنگھ کے زمانے میں ہر ایک چیز اور ہر ایک تقریب پر ٹیکس لگتا تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔ اذان دینے پر پابندی تھی اور ذبح خانے بند کیے گئے تھے۔ سکھ حکومت کے دوران مسلمانوں کی مذہبی مقامات کو نذرانے یا فنڈز دیے جاتے تھے لیکن گلاب سنگھ نے کشمیر کا مالک بننے کے ساتھ ایسی ہر ایک فنڈنگ روک دی۔ لیکن دوسری جانب وہ ہندوؤں کی مذہبی مقامات بالخصوص مندروں کی تعمیر کے لیے دل کھول کر پیسے دیتے رہے۔ ہندوؤں کی مذہبی مقامات سے وابستہ افراد کو مشاہرہ بھی دیا جاتا تھا۔

آج ہم کہتے ہیں کہ آر ایس ایس بھارت کو ہندو سٹیٹ بنانا چاہتی ہے لیکن ڈوگرہ راج کے دوران کشمیر ایک ہندو سٹیٹ بنائی جا چکی تھی جس میں مسلمانوں کو کوئی مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی۔

گلاب سنگھ ایک شاطر حکمران تھا۔ لاہور یونیورسٹی بنانے کے لیے اگر کسی نے سب سے زیادہ پیسے دیے تو وہ گلاب سنگھ تھے۔ لیکن کشمیر میں کوئی تعلیمی ادارہ قائم نہیں کیا۔ لاہور یونیورسٹی کی دل کھول کر فنڈنگ کا مقصد بیرون کشمیر اپنی شبیہہ بہتر بنانا تھا۔

انگریز کشمیر پر قبضہ کیوں نہیں کرتے؟

وارث الانور کے مطابق کشمیری مسلمان گلاب سنگھ سے اتنے تنگ آ چکے تھے کہ وہ کشمیر آنے والے برطانوی سیاحوں سے پوچھا کرتے تھے کہ آپ یہاں حکومت خود کیوں نہیں کرتے۔ کئی انگریز سیاحوں نے لکھا ہے کہ جب وہ اور ان کے ساتھی کشمیر کے دیہات میں جاتے تھے تو وہاں کے مقامی لوگ ان سے استفسار کیا کرتے تھے کہ آپ یہاں حکومت کیوں نہیں کرتے۔ بے شک گلاب سنگھ نے کشمیر کو خریدا تھا لیکن اس کی حکومت ایسٹ انڈیا کی نگرانی میں ہی چلتی تھی۔ یہاں کے لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید انگریزوں نے گلاب سنگھ کو عارضی مدت کے لیے کشمیر کا ناظم بنایا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کہتے ہیں کہ ڈوگرہ خاندان کشمیریوں کو اپنے زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ کشمیریوں کو بیگار یا جبری مزدوری پر بھیجا جاتا تھا اور اس کے عوض کوئی پیسہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اس جبری مزدوری کے دوران بہت سے لوگ مر جاتے تھے۔

دیہات میں بیگار پر لے جانے کے لیے لوگوں کی پریڈ کرائی جاتی تھی اور معمر افراد کو چھوڑ کر دیگر افراد بالخصوص نوجوانوں کو اس کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔

جیسے ۱۹۹۰ کی دہائی میں کریک ڈاؤنز کے دوران عورتیں مردوں کو بھارتی فوج سے بچانے کے لیے سامنے آتی تھیں اسی طرح ڈوگرہ راج میں بھی ہوتا تھا۔ جب یہاں سے ۱۰۰ لوگوں کو بیگار کے لیے گلگت بھیجا جاتا تھا تو وہاں سے ۹۰ ہی واپس آتے تھے۔ کشمیریوں کو گلگت اکثر خزاں کے موسم میں لے لیا جاتا تھا جہاں انہیں سرحدوں پر تعینات فوج کے لیے گولہ بارود اور غذائی اجناس اپنے کاندھوں پر لے جانا پڑتے تھے۔ بیگار پر لے جانے والوں کو بمشکل ہی کھانا اور کپڑے دیے جاتے تھے۔ کچھ کو راستے میں ہی بیچا جاتا تھا۔

ڈاکٹر محمد امین ملک اپنی کتاب تحریک حریت کشمیر میں نیشنل کانفرنس کا کردار میں لکھتے ہیں کہ ہندو، سکھ، پیرزادے، گوجر اور وہ کاشتکار جو سرکاری اہلکاروں کو دی جانے والی رقوم پر کام کرتے تھے بیگار سے مستثنیٰ تھے۔

ظریف احمد ظریف کہتے ہیں کہ اگرچہ کشمیر میں ڈوگرہ شاہی حکومت کا خاتمہ ۱۰۱ سال بعد سنہ ۱۹۴۷ میں ہوا لیکن ان کا نظام حکومت بشمول اسٹامپ اور قوانین سنہ ۱۹۴۹ تک نافذ العمل رہے۔ رنبیر پینل کوڈ یا رنبیر ضابطہ تعزیرات کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت کے خاتمے یعنی ۲۰۱۹ تک جاری رہے۔

غلام فرید اوہدی اوہ جانے

تحریر: ڈاکٹر صغرا صدف

یہ ایک مصرعہ نہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ ہے۔مکتبِ فکر ہے،سنہری اصول ہے، عملی اظہار ہے۔صوفیا کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ ان کا کوئی ایک مصرع روح میں اتار لیا جائے تو یقین کی طاقت سے بے کار الجھنوں کا قفس تار تار ہو جاتا ہے اور انسان خود کو کائنات کے رنگ برنگے گلشن میں پاتا ہے جہاں بے عمل جیون پودوں کو پانی دینے پر مامور ہوتا ہے۔مالی محنت اور لگن سے کائنات کے صحن کو سرسبز بنانے کی جستجو کرتا ہے۔سبزے پر زندگی کا انحصار ہے۔وہ دیہاڑی دار کی طرح محنت کرتا اور اجر خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔اس کا اجر پھل اور پھول ہیں۔میاں محمد بخش نے کہا تھا:

مالی دا کم پانی دینا تے بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھَل پھُل لانا لاوے یا نہ لاوے

بھر بھر مطلب ذوق وشوق سے اپنا کام کرنا، تمام توانائیاں حرکت میں لانا اور پھر کرم کی امید رکھنا اس قادرِ مطلق سے جو کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔خواجہ فرید کے اس مصرعے کو یقین کی طشتری پر سجا لیں تو زندگی کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے،زندگی کا خوبصورت چہرہ سامنے آجاتا ہے، فیصلہ ہو جاتا ہے کیا کرنا ہے، کس طرف جانا ہے، کیسے جانا ہے، رستہ جگنوؤں سے بھر جاتا ہے کیونکہ صوفیا اپنی زندگی بھر کی ریاضت، باطن کی رہنمائی، خدا اور رسولؐ کے عشق سے بہرہ ور ہو کر دانش کے اس مقام تک رسائی پاتے ہیں جہاں ہر حقیقت صاف پانی میں واضح دکھائی دینے لگتی ہے۔گندگی اور بدصورتی دل کے اس دریا کو گدلا کرتی ہے جو نظر کے آئینے سے جڑا ہے۔نظر کا آئینہ دل کی روشنی سے دیکھتا ہے۔اگر وہ شفاف ہو جائے تو ہر طرح کا گدلا پن ختم ہو جاتا ہے اور زندگی کی کشتی رواں ہو جاتی ہے۔ہمارا بیشتر وقت دوسروں پر تنقید بلکہ دوسروں کے اعمال کا تجزیہ کرنے میں گزر جاتا ہے۔لیکن ہماری تمام تر تنقید تحقیق اور تجزیہ دوسروں کی برائیاں ڈھونڈنے میں صرف ہوتا ہے ہمارا خیال دوسروں کا محاسبہ کرنے اور ہماری سوچ دوسرے کے اعمال بلکہ خیالات کی فکرمندی کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔اس فکرمندی میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ کرنا تھا، ہمیں بھی خدا نے کسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے دوسروں کے محاسبے میں ہم اپنی ڈیوٹی، اپنا فرض، اپنا منصب اور اپنی ذمہ داری بھول جاتے ہیں اور یہ عمل جب اجتماعی رویہ بن جائے تو بے عملی قومی ابتری بنتی جاتی ہے۔

میرے لئے یہ ایک مصرعہ نہیں بلکہ زندگی کا فلسفہ ہے کہ وہ جو آپ پر تنقید کر رہا ہے، جو آپ پر کیچڑ اچھال رہا ہے، جو آپ کو برا کہہ رہا ہے آپ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنا فریضہ نبھانے کا آغاز کریں۔دھوپ کا رونا رونے کی بجائے پودوں کو پانی دینا شروع کریں۔بے گھر اور مجبور لوگوں کی تصاویر شیئر کرنے کی بجائے کسی پناہ گاہ، کسی سائبان کی تعمیر کے لئے دیوار اٹھانی شروع کریں۔عمل کی نیت خیر بانٹنے اور زندگی کو خوبصورت بنانے کے عزم سے لبریز ہے۔وزیر اعلیٰ پنجاب جناب عثمان بزدار نے اپنی تقریر کے آغاز میں یہ شعر پڑھا تو ان کی تمام حکمتِ عملی واضح ہو گئی۔وہ اس کے بعد ایک لفظ کہے بغیر خدا حافظ کہہ دیتے تو بھی یہ ایک مکمل پیغام اور اعلان تھا۔بجٹ کے اعداد و شمار اور تقابلی جائزے میسر ہو جاتے ہیں لیکن دل کے جذبے، رویے اور ذہن کے آئینے کی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔یہ شعر ان کی تمام تر حکمت عملی، فکری رجحان اور نظریاتی کاوشوں کا آئینہ ہے۔۔آج تک ہر بجٹ تنقید کا نشانہ رہا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں سہولتوں کا اضافہ بھی مہنگائی کا باعث بنتا ہے۔عالمی منظر نامے پر چیزوں کے ریٹ، مانگ اور حیثیت اوپر نیچے ہونے سے قیمتیں متعین ہوتی ہیں۔تنقید کرنی مقصود ہو تو مثبت چیزوں میں بھی کیڑے نکال کر دکھائے جا سکتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی بجٹ مثالی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ بجٹ بنانے والے پیش کرنے والے اور جن کے لیے بجٹ بنایا جاتا ہے وہ سب انسان ہیں، فرشتے نہیں۔میرے لیے اس بجٹ میں اسپورٹس پالیسی، نئے گراؤنڈ اور 15 تحصیلوں میں سپورٹس کمپلیکس، ضلعی ترقیاتی بجٹ میں اضافہ اور 1122 کو باقاعدہ محکمے کا درجہ دینا زیادہ اہمیت کے حامل منصوبے ہیں۔تحصیلوں کی سطح پر ترقیاتی منصوبوں کا اعلان دراصل لوگوں کو ان کے دروازے پر سہولتیں اور امکانات فراہم کرنا ہے جس سے بڑے شہروں میں آبادی کا سیلاب کم ہو گا۔کھیل نوجوانوں کی طاقت کا مثبت عملی اظہار ہے۔طاقت کے دریا پر بند باندھ دئے جائیں تو وہ سیلاب یعنی تخریب میں بدل جاتا ہے۔کاش ہر فرد خواجہ فرید کے اس کلام کو زندگی کا پیمانہ بنا کر عمل کی رہگزر پر سفر شروع کر دے۔ترقی اور تبدیلی صرف چند لوگوں کی محنت سے نہیں بلکہ اکثریت کی حرکت سے آتی ہے۔

غلام فرید اوہدی اوہ جانے
ساکوں اپنی توڑ نبھاون دے

ہفت روزہ ”لاہور“ روزنامچے کی اشاعت کے بعد

ہفت روزہ لاہور کا وجود ہمیشہ ہی بھٹو صاحب کو کھٹکتا رہا انہوں نے پہلے مدیر ”لاہور“ کو زیرِ بار احسان کرنے کے لئے دو کاروں اور چینی کے پرمٹ بھجوائے جب شاہین اس پر زیرِ دام نہ آیا تو سرگودھا میں مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے صدر راؤ عبدالمنان سے (جو پنجاب میں) انسپکٹر جنرل پولیس راؤ عبدالرشید کے عزیز تھے۔ لاہور کے پبلشر اور پرنٹر کے خلاف ”ازالہ حیثیت عرفی“ کا ایک استغاثہ دائر کروایا اور جب یہ سازش بھی نامراد ثابت ہوئی تو روزنامچہ کی اشاعت کی پاداش میں ”لاہور“ کے پبلشر (ثاقب زیروی) اور پرنٹر (میاں محمد شفیع عرف م۔ش) کے خلاف ”ڈیفنس آف پاکستان رولز“ کے تحت دو کیس تھانے میں رجسٹر کروا دیئے جن میں سے ایک میں دس سال اور دوسرے میں پندرہ سال سزا تھی اور ”ڈی پی او“ کے تحت درج ہونے والے ان مقدمات کو بھٹو صاحب کے چہیتے اور ان کی داد و ہش سے (ربوہ ریلوے اسٹیشن پر 29 مئی 1974ء کو برپا ہونے والے ایک جعلی فساد کو ہوا دینے والے) اخبارات نے خوب خوب ہی اُچھالا۔

اس روزنامچے میں جو کوئی پندرہ قسطوں میں شائع ہوا۔ تاریخ وار اور شہر وار ان مظالم کی مختصر تفصیل دی گئی تھی جو ان کے ڈیڑھ، دو ہزار (مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ، قتلِ عام اور تباہی و بربادی میں ماہر خرید کردہ کارندے) احمدیوں کے خلاف جگہ جگہ ڈھاتے رہے تھے۔ اور جن کے ثبوت کے طور پر ان تمام مظالم کے خلاف دائر کردہ ابتدائی اطلاعی رپورٹوں ”ایف آئی آرز“ کی نقول ادارہ لاہور کے پاس تھیں۔ ہمارے لئے اب کوئی چارہ باقی نہ تھا کہ مقدمات رجسٹر ہونے کی اطلاع ملتے ہی ”ضمانت قبل از گرفتاری“ کرائیں جو چودھری عزیز احمد باجوہ (سینئر ایڈووکیٹ لاہور نے) اگلے ہی دن رٹ ہائی کورٹ میں دائر کر دی۔ جو سماعت کے لئے ڈویژن بینچ میں لگی جس کے سربراہ ریٹائرڈ چیف جسٹس سید نسیم حسن شاہ اور ایم۔ ایس۔ ایچ قریشی تھے۔

سید نسیم حسن شاہ صاحب سے صرف اتنی ہی غائبانہ واقفیت تھی کہ وہ سید محسن شاہ صاحب کے صاحبزادے ہیں جو ان دنوں زیرِ تعلیم تھے جب یہ خاکسار دو تین دفعہ ان کی کوٹھی پر حضرت امام جماعت احمدیہ صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا کوئی پیغام ”آل انڈیا کشمیر کمیٹی“ سے متعلق لے کر جاتا رہا۔ البتہ م۔ش صاحب سے وہ خوب شناسا تھے۔

عجیب بات ہے کہ جس بنچ میں ضمانت کے لئے ہماری رٹ لگی۔ اسی میں راجہ منور احمد اور مسٹر حنیف رامے کے کیس بھی تھے جو اُن دنوں حکمرانِ وقت کے زیرِ عتاب تھے اور باقاعدہ ہتھکڑیوں کے ساتھ عدالت میں لائے جاتے تھے۔ ہمارا کیس ان جج صاحبان نے کوئی چھ ماہ تک سُنا اور سُنا بھی ایسا کہ شروع تک نہ کیا بس ہر دفعہ ڈیڑھ، دو ماہ کی تاریخ دے دی جاتی اور ایڈووکیٹ جنرل سے کہہ دیا جاتا کہ ہم نے ابی سماعت شروع نہیں کی انہیں گرفتار نہ کیا جائے اور پولیس کو منع فرما دیتے جو ہر تاریخ پر ہتھکڑیوں کے ساتھ عدالت کے دروازے پر موجود ہوتی تھی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ جسٹس نسیم حسن شاہ جرأت آفریں اور ہمت افزا و معنی نگر تبصرے کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور اس انداز سے تبصرہ فرماتے ہیں کہ سرکاری عمال کی گردنیں ندامت سے جُھک جاتی ہیں مثلاً جب پہلی پیشی ہوئی تو سید نسیم حسن شاہ صاحب نے دریافت فرمایا

”ملزم کہاں ہیں؟ Where is the accused?“ ”مَیں نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔“ مائی لارڈ۔ ”مَیں ہوں ثاقب زیروی“

فرمایا: ”وہ ثاقب زیروی جو تحریکِ پاکستان میں اس ملک اور قوم کے ترانے گاتا رہا جس کی قومی نظموں کی بڑی دھوم رہی“

”اور شریکِ الزام: Co-Accused“ اس پر میاں محمد شفیع عرف م۔ش کھڑے ہوئے اور عرض کیا مائی لارڈ ”م۔ش“

فرمایا: ”وہ! “م۔ش” میں محمد شفیع (علامہ اقبال کا سیکرٹری) جو اس ملک اور قوم کے لئے دو دفعہ قید ہوئے۔“

”مسٹر ایڈووکیٹ جنرل! تحریکِ پاکستان کے ان دو جیّد کارکنوں سے بہتر لوگ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے لئے کہاں مل سکتے ہیں بہرحال ہم آج سماعت نہیں کر رہے انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔“

کوئی ڈیڑھ ماہ بعد دُوسری پیشی ہوئی۔ اور سید نسیم حسن شاہ صاحب نے اس عاجز کو مخاطب کر کے فرمایا

”مسٹر ثاقب زیروی! یہ جو روزنامچے میں آپ نے بعض تفاصیل شائع کی ہیں یہ واقعات کہیں ہوئے بھی ہیں یا آپ نے محض شعر ہی کہہ دیئے ہیں؟“

عرض کی۔ ”مائی لارڈ! All these are facts اور ان تمام سانحات کی ابتدائی اطلاعی رپورٹوں کی نقول میرے پاس محفوظ ہیں“

فرمایا:

“All these are facts and you are discussing the facts in this regeim. How simple you are“

یعنی: یہ تمام باتیں حقائق پر مبنی ہیں اور آپ اس دورِ حکومت میں حقائق زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ آپ بھی کتنے سادہ ہیں۔

”مسٹر ایڈووکیٹ جنرل ان کی سادگی کی داد دیجئے ابھی ہم سماعت شروع نہیں کر رہے انہیں

گرفتار نہ کیا جائے۔"

اور پھر دو ایک پیشیوں کے بعد چودھری عزیز احمد صاحب باجوہ (مرحوم و مغفور) کو بُلوا کر کہا کہ ہمارے پاس تو ڈی پی آر میں ضمانت لینے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ آپ خاموشی سے درخواست واپس لے لیں ہم ایڈووکیٹ جنرل سے وعدہ لے لیتے ہیں کہ انہیں گرفتار نہ کیا جائے اور چودھری صاحب نے ایسا ہی کیا۔ مگر اوپر سے انسپکٹر جنرل پولیس کو بدستور گرفتاری کی ہدایت آتی رہیں یہاں تک کے ایک دن قلعہ گوجرسنگھ کے تھانیدار صاحب آئے اور آئی جی صاحب کی ہدایت کے بارے میں بتایا۔ مَیں نے انہیں اعتماد میں لے کر بتایا کہ "ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت عالیہ سے گرفتار نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔" وہ کہنے لگے: "اگر یہی بات ایڈووکیٹ جنرل یا ان کے نائب مجھے کہہ دیں تو میں تعمیل حکم سے بچ جاؤں گا۔"

مَیں نے ہائیکورٹ بار میں پیغام بھجوایا۔ چودھری عزیز احمد باجوہ اور ان کے بھائی چودھری محمد عبداللہ باجوہ ایک چھوٹی سی کار میں پہنچ گئے اور پھر مجھے اور تھانیدار صاحب کو لے کر ایڈووکیٹ جنرل اور ان کے نائب کی کوٹھیوں کا کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک طواف کرتے رہے مگر دونوں میں سے کوئی نہ ملا حتٰی کہ تھانیدار صاحب نے کہا: "چودھری صاحب آپ ٹھیک فرمارہے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب زیادہ تردد نہ فرمائیے۔ میں آئی جی صاحب کو یقین دلادوں گا۔" اللہ اللہ جب وہ مالک الملک اپنے کسی بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو کس طرح اپنے فرشتہ سیرت بندوں کو اس کی امداد کی تاکید فرمادیتا ہے۔

پی این اے کی تحریک زوروں پر تھی۔ بھٹو صاحب انتخابات پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہفت روزہ لاہور 32 ملکوں میں جاتا ہے اور ملکوں کے سفراء کی طرف سے انہیں روزنامچے کی تفاصیل پر کئی ملکوں کی طرف سے احتجاج کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ تنگ آکر انہوں نے حکم دیا کہ ہمیں گرفتار کرلیا جائے۔ پولیس کی ایک باقاعدہ نفری آئی اور مجھے لے گئی پھر م۔ش صاحب کو بھی پریس سے لے لیا۔ قلعہ گوجرسنگھ کا تھانہ ان دنوں زیرِ تعمیر تھا۔ اس لئے انسپکٹر صاحب نے ہم ملزموں کے لئے ایک خیمہ نصب کر رکھا تھا جس میں ایک میز، دو کرسیاں اور ایک چارپائی تھی۔ اتنے میں منشی لال دین صاحب نے ہمارے وکلاء کو پیغام بھجوادیا۔ ان میں سے تین تو ہمارے پاس پہنچ گئے دو ہوم سیکرٹری سے ملنے چلے گئے اور ایک ایڈووکیٹ جنرل صاحب سے جاملے۔

شام اتری تو ایس۔ ایچ۔ او صاحب خیمے میں تشریف لائے اور کہا کہ: "ہمارے یہاں کوئی حوالات نہیں ہے۔ ہمیں آپ کو بہرحال سول لائینز کے تھانے میں بھیجنا ہو گا مگر میرا خیال ہے کہ ہم آج لکھت پڑھت نہ کریں۔ آپ اپنے گھروں میں جاکر آرام کریں۔ اور کل ساڑھے نو سے 10 بجے کے درمیان آجائیں اور ٹربیونل میں ضمانت کے لئے درخواست دیتے آئیں۔"

عرض کیا۔ "کیا آج ہمیں آپ ہماری مرضی سے لائے تھے یا اپنی مرضی سے اور کیا کل کوئی آپ کا اہلکار وہاں آئے گا یا ہم خود ہی آجائیں۔" جواب ملا۔ "ہمارا کوئی اہلکار گیا تو سو باتیں بنیں گی۔ آپ باعزت لوگ ہیں ہم آپ پر اعتماد کرتے ہیں آپ خود ہی آجائیں۔"

مَیں م۔ش صاحب کے یہ کہنے پر کہ چار پانچ دن ہماری ضمانت نہیں ہو گی آخر بڑے صاحب کا حکم ہے گھر آکر رات بھر اگلے ہفتے کا پرچہ تیار کرتا رہا اس کے بعد نوافل کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ گرفتاری نہیں ہو گی۔ کوئی پونے نو بجے کے قریب م۔ش صاحب آگئے اور میں اُن کے اصرار کے باوجود ساز و سامان کے بغیر ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پریس میں پہنچے، چائے منگوائی، کوئی ساڑھے نو بجے مرزا نصیر احمد اور چودھری اعجاز نصراللہ خاں ایڈووکیٹ پہنچ گئے۔ ہم نے کہا۔

"آپ چائے پی کر جائیں گے یا آکر پئیں گے؟" وہ جلد ہی تھانے کو چلے گئے جب لوٹے تو ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ بھی تھا۔ کہنے لگے انسپکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ: "گرفتاری نہیں ہو گی۔ آج ساڑھے آٹھ بجے صبح بھٹو صاحب کے سیاسی مشیر جناب (محمد حیات ٹمن) کا فون آیا ہے کہ گرفتاری نہ ڈالی جائے۔" (تجربات جو ہیں امانت حیات کی)۔

ساقیٔ کوثر سے

(ثاقب زیروی)

کوئی ایسا جام بھی ساقیا جو سراپا سوز و گداز ہو
سرِ طور ان سے ہو گفتگو سرِ عرش راز و نیاز ہو
مَیں ترے کرم کا مجاز ہوں یہی بخششوں کا جواز ہو
مرے دامنِ دلِ مضطرب کو نصیب خاکِ حجاز ہو
یہ حضورؐ پاک کی روشنی کہ فضا کو نُور ہے زاہدو
اسی نُور سے جو وضو کرو تو ادا دلوں کی نماز ہو
تری چشمِ لُطف عطا کرے وہ ستارہ گیر جسارتیں
کہ جمالِ طُور کی راہ میں نہ نشیب ہو نہ فراز ہو
ترا لُطفِ خاص ہو بے کراں تیرا عفو سب پہ ہو ضوفشاں
مری آرزو ہے کہ سلسلہ تری رحمتوں کا دراز ہو
یہی آرزو، یہی التجا، یہی ہر گھڑی ہے مِری دُعا
مری کائناتِ حیات میں ترا عشق درد و گداز ہو
تری عظمتوں کا جواب کیا تیری رفعتوں کا حساب کیا
یہ تیرا مقامِ بلند ہے کہ خدا سے راز و نیاز ہو
تیرے دستِ فیضِ دوام سے جو طلب کیا ہے سو مِل گیا
کوئی مجھ سا طالبِ عفو ہو کوئی تجھ سا بندہ نواز ہو
ترے دِل میں ثاقبِ خستہ جاں نہ ہو ظلمتوں کا کوئی نشاں
تری آرزو کی بساط پر جو وہ حُسن جلوہ طراز ہو

گینزبک میں مزید 4 پاکستانی نام

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ۴ مزید ریکارڈز پاکستان کے نام ہو گئے۔ پاکستانی محمد راشد نے سے ورلڈ ریکارڈ چھین لیا، پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں، قومی کھلاڑی دنیا میں نام بنا رہے ہیں۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں پاکستان نے چار مزید ریکارڈز اپنے نام کر لئے۔ پاکستانی محمد راشد نے ہند سے ورلڈ ریکارڈ چھین لیا۔ محمد راشد نے بغیر رکے ایک منٹ میں ۴۲۸ مکے برسا کر ہند کا ریکارڈ توڑ دیا۔ پاکستانی اسد حنیف نے ایک منٹ میں انگوٹھوں کے سہارے ۴۳ پش اپس نکال کر نیا ریکارڈ بنایا۔ ۴۰ پونڈ وزن کیساتھ انگوٹھوں کے بل پر ہی ۲۸ پش اپس نکالنے کا ورلڈ ریکارڈ بھی حنیف کے نام رہا۔ محمد نعمان نے ایک منٹ میں ۲۹۹ مرتبہ اسٹک سے ہٹ کر کے ورلڈ ریکارڈ بنایا۔

گینز ورلڈ ریکارڈز کو ۲۰۰۰ء تک گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کہا جاتا تھا۔ ہر سال شائع ہونے والی اس کتاب میں دنیا بھر میں مانے گئے ورلڈ ریکارڈ جو کہ کوئی انسانی کارنامہ ہو یا پھر کوئی قدرت کی غیر معمولی بات ہو ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔ یہ کتاب دنیا میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ ماہنامہ ''خالد'' ربوہ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اس عالمی ریکارڈ کی تاریخ مکرم محسن بن سہیل کے قلم سے شامل اشاعت ہے۔

۴ مئی ۱۹۵۱ء کو Sir Hughe Bearer جو کہ Guiness Brewery کے ڈائریکٹر تھے، ایک شوٹنگ پارٹی میں ہونے والی اس بحث میں شامل ہوئے جس کا موضوع تھا کہ دنیا کی تیز ترین گیم کونسی ہے؟ اسی مباحثے میں Hughes کو احساس ہوا کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی کتاب نہیں جو کہ ریکارڈز بنانے اور اُن کے توڑنے کی تاریخ پیش کرتی ہو۔ چنانچہ Guiness کے ایک ملازم نے اُن کے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور دو جڑواں بھائیوں (جن کی لندن میں Fact Finding Agency تھی) کو یہ کام سونپا گیا۔ اُن کی کاوش سے ۱۹۵۴ء میں ریکارڈز کی پہلی کتاب ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہو کر فروخت ہوئی۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مختلف دلچسپ مقابلوں کے علاوہ قدرت کے عجیب مناظر کو بھی ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا سب سے زہریلا پودا، سب سے چھوٹا دریا، سب سے زیادہ چلنے والا ڈرامہ اور اسی طرح کے سینکڑوں ریکارڈ شامل اشاعت کئے جاتے ہیں۔ ہر سال ۹ نومبر کو انٹرنیشنل گینز ورلڈ ڈے منایا جاتا ہے تاکہ نئے ریکارڈ بنانے اور پرانے ریکارڈوں کو توڑنے کا جذبہ اجاگر ہو۔ تاہم تمام ایسے ریکارڈز جو کسی بھی جاندار کے لئے خطرناک ثابت ہوں، انہیں اس کتاب میں شامل نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دنیا کی سب سے وزنی بلّی کے مقابلہ کے لئے بلیوں کے مالکان نے اپنی بلیوں کو مضر صحت اشیاء کھلا کر موٹا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح تلوار کو نگلنے اور سڑکوں پر تیز رفتاری جیسے ریکارڈز بھی اس میں شامل نہیں کئے جاتے۔ ۱۹۷۶ء میں گینز بُک آف ورلڈ ریکارڈ میوزیم بھی کھولا گیا تھا جس میں دنیا کے سب سے لمبے انسان اور سب سے لمبے کینچوے کا مجسمہ رکھا گیا۔ اس کے علاوہ اس میوزیم میں تلوار نگلنے والے شخص کا X-ray، بادلوں کی بجلی کا نشانہ بننے والے انسان کی ٹوپی جو کہ بار بار بجلی گرنے کی وجہ سے سوراخوں سے بھر چکی ہے، نیز گولف کے ایسے جوتے جن میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے ہیں، بھی اس میوزیم کا حصہ ہیں۔

❁❁❁

فورٹ ولیم کالج

انگریزوں کا قائم کیا گیا وہ تعلیمی ادارہ جس کا وجود محض چند سال کا رہا مگر اثرات دو صدیاں بعد بھی باقی ہیں

تحریر: مرزا اے بی بیگ

جولائی ۱۰ سنہ ۱۸۰۰ ایک یادگار تاریخ ہے کیونکہ ہندوستان کے اس وقت کے سب سے بڑے شہروں میں سے ایک کلکتہ کے فورٹ ولیم میں ایک کالج کا قیام عمل میں آتا ہے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس وقت کے گورنر جنرل انگلینڈ میں بورڈ آف ڈائریکٹروں کو ایک خط لکھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ اس کا قیام ۴ مئی ۱۸۰۰ مانا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے ہاتھوں 'شیر میسور' ٹیپو سلطان کی شکست اور موت کی پہلی سالگرہ کے طور پر اس کالج کے قیام کو یادگار بنایا جائے۔ لارڈ ویلزلی اس کو 'آکسفورڈ آف دی ایسٹ' یعنی مشرق دنیا کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی حیثیت سے پروان چڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کالج جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے برصغیر کی تقدیر لکھنے میں اہم کردار ادا کیا اس کا وجود چند سالہ ثابت ہوا تاہم اس کے اثرات دو صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی پائے جاتے ہیں۔

اس کا قیام تو نوجوان انگریزوں کو ہندوستانی زبان و ادب اور مشرقی علوم و فنون سے روشناس، آراستہ و پیراستہ کروانے کے لیے عمل میں آیا تھا لیکن اس نے ہندوستانی زبان و ادب کا رخ موڑ دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لندن میں موجود بورڈ آف ڈائریکٹرز اس کے قیام کے حق میں نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس کام کے لیے انگلینڈ میں تعلیم کا نظام موجود تھا جہاں سے فارغ التحصیل نوجوانوں کو انڈیا بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے تسلط کو مضبوط اور مستحکم بنا سکیں۔

فورٹ ولیم کالج اپنی ابتدا سے ہی انگریزوں کے درمیان ہی تنازعے کا شکار رہا اور بعد میں ہندوستانیوں کے درمیان بھی بڑے تنازع کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی 'بانٹو اور راج کرو' کی پالیسی کی طرح یہیں سے پہلی بار اردو اور ہندی کا فرق ایک شگاف کے طور پر ابھرا جو بڑھتے بڑھتے اس حد تک جا پہنچا کہ ہندوستان بالآخر دو ممالک انڈیا اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا اور پھر پاکستان سے زبان اور جغرافیائی و سیاسی اختلافات کی وجہ سے ایک علیحدہ ملک بنگلہ دیش بھی وجود میں آیا۔ بہت سے ناقدینِ ادب اس بیانیے سے اتفاق نہیں کرتے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ فرق پہلے سے ہی موجود تھا کیونکہ یہاں ہر کوس دو کوس پر پانی اور وانی یعنی بولی بدل جاتی ہے چنانچہ بہت سے مستشرقین نے انڈیا کو 'زبانوں کا عجائب خانہ' بھی کہا ہے۔

ان میں سے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ لوگ ایسٹ انڈیا کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر اپنا اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے یا اپنی کھچڑی الگ پکانے کے لیے زبان کی بنیاد پر تقسیم و تفریق کے دعوے کر رہے تھے۔

فورٹ ولیم کے قیام سے قبل

سنہ ۱۷۵۷ میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان پلاسی کی جنگ نے انگریزوں کو انڈیا میں پاؤں جمانے کا موقع فراہم کیا لیکن لارڈ کلائیو کی قیادت میں ہی بنگال کے نواب میر قاسم کے خلاف سنہ ۱۷۶۴ میں ہونے والی بکسر کی جنگ نے پورے بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو مستحکم کر دیا۔

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ انھیں یہاں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کے کام کاج کے انتظام و انصرام میں ان کی مدد کر سکیں اور اسی کے پیش نظر گورنر جنرل وارن ہیسٹنگس نے اکتوبر سنہ ۱۷۸۰ میں کلکتہ مدرسہ قائم کیا جسے بعد میں مدرسہ عالیہ کے نام سے جانا گیا۔

اس مدرسے کے ایک سال کا خرچ انھوں نے اپنی جیب سے پورا کیا جسے بعد میں انگریزوں کی بنگال میں قائم حکومت نے منظور کر لیا اور وارن ہیسٹنگس نے سال بھر تک جو خرچ کیا تھا وہ انھیں واپس ادا کر دیا گیا۔

اس کے چار سال بعد کلکتہ سپریم کورٹ کے جج سر ولیم جونز کی تجویز پر ایشیا اور بطور خاص جنوبی ایشیا کے مطالعے کے لیے 'ایشیاٹک سوسائٹی' کا قیام عمل میں آیا۔

اسی طرح فورٹ ولیم کے قیام سے قبل ہمیں گلکرسٹ کا مدرسہ نظر آتا ہے جسے بعد میں فورٹ ولیم میں ضم کر دیا گیا کیونکہ گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ واضح رہے کہ گلکرسٹ ایک سرجن یا معالج کے طور پر انڈیا لائے گئے تھے اور ان کی تعیناتی کلکتے کے بجائے بمبئی میں ہوئی تھی لیکن پھر ان کا تبادلہ ہوتا رہا اور وہ شمالی ہند کے مختلف علاقوں میں خاصا وقت گزارنے کے بعد کلکتے پہنچے تھے۔

انھوں نے ہی پہلی بار یہ محسوس کیا اور دعویٰ بھی پیش کیا کہ اس ملک میں ایک زبان ایسی ہے جو پورے شمال ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اسے انھوں نے 'ہندوستانی' زبان کا نام دیا۔ بہرحال یہ بحث الگ ہے کہ اس وقت اردو یا ہندی کا علیحدہ علیحدہ تصور تھا کہ نہیں۔

فورٹ ولیم کالج پر تحقیق کرنے والے اور جواہر لعل نہرو کے سابق پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے گلکرسٹ کے حوالے سے اپنی کتاب 'گلکرسٹ اینڈ دی لینگویج آف ہندوستان' میں کہا ہے گلکرسٹ کو یہاں کی زبان سیکھنے میں اتنی دشواری پیش آئی کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کی ایک گرامر تحریر کر دی جو کہ پہلی ایسی کتاب تھی جس کی بنیاد پر انگلینڈ سے آنے والوں کو تعلیم دی جانے لگی۔

دہلی یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر ہریش ترویدی کا خیال ہے کہ گلکرسٹ سے ہندوستان کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی اور انھوں نے تو ہندی اور بنگلہ زبانوں کو بھی ایک سمجھ لیا تھا۔ ان کی ایک غلطی کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے سنہ ۲۰۱۹ میں ریختہ کے ایک پروگرام میں کہا کہ 'گلکرسٹ تاج محل کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہاں شاہ جہاں اور ان کی اہلیہ نور جہاں دفن ہیں۔' انھوں نے بتایا کہ یہ اب انھیں کون بتائے کہ وہاں جہاں جیسے سرنیم کی بات نہیں تھی۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو زبان کے معروف شاعر مرزا محمد رفیع سودا کی شاعری اور قصائد سے سیکھی جبکہ آج کے دور میں اردو کے استاد بھی سودا کے قصائد کو بہت آسانی سے نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

فورٹ ولیم کے قیام کا مقصد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز سول سرونٹس کو ہندوستان کی زبان ثقافت اور عدالتی نظام سے روشناس کروانے کے لیے ہوا تھا۔ لیکن اس ادارے کے پورے ڈھانچے پر نظر ڈالی جائے تو یہ براہ راست چرچ آف انگلینڈ کے زیر اثر تھا۔ اس کا ایک بڑا مقصد کرسچن مشنری کاموں کو سرانجام دینا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۷۹۹ میں جنوبی ہند کے سری رنگاپٹنم میں جب ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی تو وہاں سے انگریزوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اسے دیکھ کر کہا کہ اب انڈیا میں بائبل کی ترویج و اشاعت کے لیے راہ ہموار ہو گئی ہے۔

واضح رہے کہ وہ وقت بنگال میں نشاۃ الثانیہ کا دور تھا اور رام موہن رائے جیسے مفکر اس کے سرخیل تھے۔ چنانچہ ہر طرح کے خیالات کے لیے وہاں گنجائش موجود تھی۔

کالج کا قیام ۱۰ جولائی کو عمل میں آیا جب کہ اس کا سٹیچیوٹ ۱۸ اگست کو منظور کیا گیا لیکن ٹیپو سلطان کی شکست کی تاریخ کو یادگار بنانے کے لیے اس کے قیام کا دن ۴ مئی قرار پایا۔ بہر حال کالج کا پہلا سیشن چھ فروری سنہ ۱۸۰۱ سے شروع ہوا۔

کالج کے سٹیچیوٹس میں اس کے قیام کے مقصد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

'فورٹ ولیم کالج کا قیام بہت حد تک مسیحی مذہب کی بنیادوں پر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد نہ صرف مشرقی ادبیات کا فروغ ہے بلکہ طلبہ کو انڈیا کے برطانوی سامراج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت جہاں انھیں مقرر کیا جاتا ہے وہاں وہ برطانیہ کے پر مغز قانون اور آئین کو نافذ کریں گے اور کرّہ کے اس حصے میں عیسائی مذہب کی سربلندی کے لیے کام کریں گے۔ اس میں اس وقت تک کسی کو بھی اعلیٰ عہدے پر مقرر نہیں کیا جائے گا یا پروفیسر نہیں بنایا جائے گا جب تک کہ وہ عالی مقام شاہ برطانیہ سے وفاداری کا عہد نہیں اٹھاتا اور مندرجہ ذیل عہد نہیں کرتا:

'میں قسم کھاتا ہوں اور صدق نیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں عوامی طور پر کوئی ایسا اصول نہیں اپناؤں گا نہ ایسی تعلیمات دوں گا جو مسیحی مذہب کے یا پھر چرچ آف انگلینڈ کے قائم کردہ اصول و ضوابط سے متصادم ہو۔

'میں قسم کھاتا ہوں اور صدق نیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کھلے عام یا ذاتی طور پر کوئی ایسی چیز نہ کروں گا اور نہ اس کی تعلیم دوں گا جو کہ گریٹ برٹین کے چرچ یا حکومت کے قوانین سے متصادم ہو اور میں ہز میجسٹی کی حکومت سے وفادار رہوں گا۔'

پہلے اس کے قیام کے لیے کولکتہ کے قلب میں واقع رائٹرز بلڈنگ کی تفویض ہوئی تھی (جو کہ اب مغربی بنگال کی ریاستی حکومت کا سیکریٹریٹ ہے)۔

اس کا استعمال سنہ ۱۷۸۰ سے انگلینڈ سے آنے والے لکھاریوں کے لیے ہوتا تھا جس میں کلاس رومز کے علاوہ ایک سائنس کی لیبارٹری اور پروفیسرز اور انتظامیہ کے سٹاف کے لیے کمرے تھے جبکہ پہلی منزل پر لیکچر روم تھے اور دوسری منزل پر چار کمرے تھے جو کہ ۳۰ فٹ لمبے اور ۲۰ فٹ چوڑے تھے۔ اوپری منزل پر ۶۸ فٹ لمبا اور ۳۰ فٹ چوڑا ایک ہال تھا جسے امتحانی ہال بنانا مقصود تھا۔

لیکن لارڈ ویلزلی کے منصوبے اس سے کہیں زیادہ تھے اس لیے اسے ہوگلی ندی کے کنارے واقع وسیع و عریض قلعہ فورٹ ولیم میں قائم کیا گیا۔ یہ قلعہ کنگ ولیم سوئم کے نام پر رکھا گیا تھا اور اسے سنہ ۱۷۰۰ میں مغل حکمران کی اجازت سے تعمیر کیا گیا تھا۔

ویلزلی نے اس میں مختلف طریقہ انصاف اور قانون کی تعلیم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، سیاسی معیشت، علم کیمیا، علم نباتات، تجرباتی فلسفہ کے شعبے بھی قائم کیے۔ اس کے علاوہ یونانی اور لاطینی زبانوں کے ساتھ عربی، فارسی، سنسکرت، فرانسیسی، انگریزی اور دیسی زبانیں بھی نصاب کا حصہ تھیں۔ سسر کمار داس اپنی کتاب 'صاحب اور منشیز' میں لکھتے ہیں کہ ویلزلی اسے اورینٹل سٹڈیز کے ایک اور مرکز کے طور پر ہرگز نہیں لے جانا چاہتے تھے۔

فوٹ ولیم کے طلبہ

صدیق الرحمان قدوائی اور بہت سے دوسرے ماہرین نے شواہد کی بنیاد پر کہا ہے کہ اس میں جو طلبہ آتے تھے وہ ۲۰ سال یا اس سے کم عمر کے ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بہت تہذیب یافتہ یا اچھے کردار سے آراستہ نہیں تھے۔

کالج رہائشی یعنی اقامتی ادارہ تھا تاکہ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی کی جا سکے۔ صدیق الرحمان قدوائی نے ایک بار ہمیں بتایا کہ 'جس طرح ہندوستان کے بگڑے دل رئیس زادے اور نوابزادے تھے اسی ڈھرے پر انگلینڈ سے آنے والے یہ نوجوان تھے۔ یہ عیش کوشی کے لیے قحبہ خانے جاتے، مجرے سنتے اور بعض تو ہندوستان کے نوابزادوں کی طرح اچکن بھی پہننے لگے تھے۔'

انھوں نے کہا کہ یہ لڑکے انڈیا آنے کے لیے رشوت بھی دیتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ یہاں دولت کی ریل پیل ہے اور جتنا انھوں نے رشوت میں دیا ہے اس کا کئی گنا یہ یہاں سے حاصل کر لیں گے۔

آسام یونیورسٹی میں شعبہ ہندی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر شیتانشو کمار نے 'کمپنی راج اور ہندی' پر تحقیق کی ہے اور اسی عنوان سے ان کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

انھوں نے بی بی سی سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ گلکرسٹ کے نزدیک بھی پیسے کی بہت اہمیت تھی اور پیسے کے لیے ہی ان کے کالج کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک طرح سے آج کے پبلشر کی طرح تھے جن کا واحد مقصد پیسے کمانا ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ واپس انگلینڈ جانے کے بعد انھوں نے باضابطہ طور پر ایک بزنس کھول لیا تھا۔ اگر گلکرسٹ کے کالج سے پہلے کے دنوں پر نظر ڈالیں تو وہ بڑے منافع کے لیے نیل کی کھیتی میں بھی شامل تھے اور نیل کی کھیتی میں ہندوستان کے کاشتکاروں اور مزدوروں کا استحصال مثالی بتایا جاتا ہے۔

فورٹ ولیم کی خدمات

فورٹ ولیم کو اگرچہ نوخیز انگریز حکام کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا لیکن اس کے دور رس اثرات ہندوستان کے زبان و ادب پر مرتسم ہوئے۔

یہاں نہ صرف ہندوستانی یعنی اردو ہندی کی تعلیم دی گئی بلکہ بنگلہ اور تمل کی بھی تعلیم دی گئی۔ ان کے علاوہ اڑیسہ کی زبان اڑیا، پنجاب کی زبان پنجابی اور مہاراشٹر کی زبان مراٹھی کی نثر کے ابتدائی نقوش بھی یہاں ملتے ہیں اور ان کے قواعد بھی یہاں تیار ہوتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں بڑے پیمانے پر نثر کی ابتدا اور اس کے خدوخال تیار کرنے کا سہرا بھی اس کالج کے سر جاتا ہے یہیں فارسی اور دیوناگری رسم الخط کا معاملہ بھی اٹھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک زبان کو دو رسم الخط میں لکھنے کی بنیاد یہیں پڑی۔ ماہرین لسانیات میں اس معاملے میں بہت اختلافات ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ دونوں رسم الخط مروّج تھے۔ لیکن صدیق الرحمان قدوائی کا کہنا ہے کہ اس سے قبل زیادہ تر چیزیں فارسی یعنی آج کے اردو رسم الخط میں موجود تھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انگریزی زبان کے ریٹائرڈ پروفیسر انیس الرحمان نے ایک پروگرام کے دوران کہا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل دیوناگری رسم الخط میں پانچ چھ سے زیادہ کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ جبکہ اس کالج سے مختلف مضامین میں ایک سو سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے بیشتر کتابیں اگرچہ اب قابل قدر نہیں لیکن اردو اور ہندی یا دوسری زبانوں میں چند ابتدائی کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل ذکر ہیں۔ یہاں سے ہی ہندوستانی زبانوں میں جدید نثر کی بنیاد پڑتی ہے۔

انڈیا میں شاعری اور مرصع اور مقفی نثر تو موجود تھی لیکن سہل اور رواں زبان میں نثر کی داغ بیل یہیں پڑی جو سنہ ۱۸۲۵ میں دلی کالج کے قیام کے بعد مزید پھلی پھولی اور سرسید کی تحریک کے آتے آتے اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ فورٹ ولیم سے شائع ہونے والی کتابوں میں 'قصہ چہار درویش' کو میرامن نے سلیس ٹکسالی یعنی دہلوی زبان میں لکھا جو کہ 'باغ و بہار' کے نام سے آج بھی سکول اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ میر شیر علی افسوس کی 'آرائش محفل' ایک ہندوستانی شاہی خاندان کی کہانی ہے نہ کہ حاتم طائی کی۔ اسی طرح انھوں نے سعدی کی تصنیف گلستان کا ترجمہ 'باغ اردو' کے نام سے کیا۔ میرامن کی اخلاقیات پر تصنیف کردہ کتاب 'اخلاق محسنی' اور غلام اشرف کی 'اخلاق النبی' اہمیت کی حامل ہیں۔ شاکر علی نے داستان الف لیلیٰ رقم کی جبکہ مولوی امانت اللہ کی کتاب 'ہدایۃ الاسلام' قابل ذکر ہیں۔ خلیل علی خان کی 'داستان امیر حمزہ' اور حیدر بخش حیدری کی 'آرائش محفل' آج بھی بہت سے اداروں میں مکمل یا جزوی طور پر شامل نصاب نظر آتی ہیں۔ اسی طرح وہاں دیوناگری میں للولال کی تصنیف پریم ساگر اور مظہر علی خان کی بیتال پچیسی بھی سامنے آئی۔

فورٹ ولیم سے کس کا فائدہ؟

اس سلسلے میں ناقدین کی رائے منقسم ہے لیکن سب ایک بات پر متفق ہیں کہ کالج تو تھوڑے ہی عرصے قائم رہا یعنی ابتدائی پانچ چھ سال اس کے عروج کا زمانہ رہا جب تک ویلزلی انڈیا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل رہے یا پھر جب تک گلگرسٹ وہاں رہے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں سنہ ۱۸۰۵ میں کالج سے رخصت ہو گئے۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ گلگرسٹ کبھی بھی کالج کے پرنسپل نہیں تھے بلکہ ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے نگراں تھے۔

صدیق رحمان قدوائی کا کہنا ہے کہ کلکتہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ چمک دمک والا شہر تھا چنانچہ وہاں سے آنے والے نوخیز طلبہ یہاں کی چمک دمک میں کھو گئے اور انھوں نے بہت حد تک ہندوستان کی تہذیب کو قبول کرنا شروع کر دیا اور اسی زمانے میں سب زیادہ تہذیبی اختلاط و ارتباط سامنے آیا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم سے جو چیز سامنے آئی وہ آج تک ہمارا اثاثہ ہے۔ بہرحال بہت سے ناقدین وہاں برتے جانے والے تعصّبات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کسی بھی ہندوستانی کو وہاں پروفیسر نہیں بنایا گیا بلکہ سارے اساتذہ انگریز یا یورپی تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے منشی کا عہدہ تھا جو کئی حصوں میں تقسیم تھا۔ انگریزوں کو سب سے زیادہ ۱۶۰۰ روپے ماہانہ ملتے تھے اور سب سے کم ایک ہزار روپے جبکہ منشیوں کے سب سے نچلے درجے کو ۴۰ روپے، اس سے اعلیٰ کو ۱۰۰ روپے اور میر منشی کو ۲۰۰ روپے ملتے تھے۔

کالج کا زوال اور خاتمہ

کالج کی مخالفت انگلینڈ میں ہی زیادہ ہو رہی تھی چنانچہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ضرورت کے پیش نظر انگلینڈ میں ہی ہیلی بیری کالج سنہ ۱۸۰۶ میں قائم کیا گیا جو آج تک اپنی خدمات انجام دے رہا ہے لیکن فورٹ ولیم کا سورج بہت جلد غروب ہو گیا۔ گلگرسٹ اور لارڈ ویلزلی کے بعد اس کے بجٹ میں خاطر خواہ کمی کر دی گئی۔ بلکہ سیتانشو کمار کا تو کہنا ہے کہ کالج کے قیام کے دو سال بعد سنہ ۱۸۰۲ میں ہی اسے بند کرنے کا حکم سنا دیا گیا تھا لیکن ویلزلی نے اس پر عمل درآمد نہیں کیا اور یہ چلتا رہا۔ ان کے مطابق اس کی دمک اس وقت کم پڑ گئی جب گلگرسٹ بھی وہاں سے رخصت ہو گئے۔

سنہ ۱۸۱۳ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک چارٹر آیا جس میں ہندوستان میں تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے ایک لاکھ کی گرانٹ منظور کی گئی۔ انگریزوں کے زیر نگیں جو خطہ تھا اس کے لیے یہ رقم بہت زیادہ نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو فورٹ ولیم کالج میں جتنے اساتذہ اور مترجمین تھے یہ ان کے لیے بھی ناکافی تھی۔ اس کے بعد کالج بجٹ کی کمی کا شکار ہو گیا اور پھر یہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بند کر دیا گیا لیکن اس کا انجام پوری طرح سنہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں آیا۔

واضح رہے کہ سنہ ۱۸۳۷ میں لارڈ میکالے کی نئی تعلیمی پالیسی آئی جس نے انگریزوں کو ہندوستان کی زبان سکھانے کے بجائے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان اور تہذیب و تمدن سکھانے کا بیڑا اٹھایا اور اس طرح کالج کا جواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے برٹش پارلیمان میں اپنے خطاب کو ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: فی الحال ہم اتنا ضرور کریں کہ ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان کا کام کر سکے جو اپنے رنگ و نسل میں تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے مزاج، اپنے خیال اور اپنے اخلاق اور دانشمندی میں انگریز ہوں۔

❀❀❀

برطانیہ کے غریب ترین پیر

تحریر و تحقیق: صاحبزادہ ضیاء الرحمان ناصر

انگلینڈ میں مقیم چند پاکستانی پیر صاحبان کی معلوم دولت کا تخمینہ (آف شور دولت اور ٹرسٹ اس میں شامل نہیں)

۱۔صوفی جنید نقشبندی Grandson صوفی عبداللہ نقشبندی، سجادہ نشین آستانہ عالیہ گھمکول شریف، برمنگھم ۱۳۲ ملین پاؤنڈ۔ پاکستانی ۲۹۰ ارب تقریباً

۲۔ پیر سلطان نیاز الحسن باہو، سجادہ نشین آستانہ عالیہ سلطان باہو، برمنگھم۔ ۸۰ ملین پاؤنڈ، ۱۷۶ ارب روپے تقریباً

۳۔ پیر سلطان فیاض الحسن باہو، اسسٹنٹ سجادہ نشین آستانہ عالیہ سلطان باہو، برمنگھم ۸۳ ملین پاؤنڈ، ۱۸۳ ارب روپے تقریباً

۴۔ پیر نور العارفین صدیقی، سجادہ نشین آستانہ عالیہ نیریاں شریف، برمنگھم، ۷۷ ملین پاؤنڈ، ۱۷۰ ارب روپے تقریباً

۵۔ پیرزادہ امداد حسین، مہتمم جامعہ الکرم نوٹنگھم، ۷۶ ملین پاؤنڈ، ۱۶۸ ارب روپے تقریباً

۶۔ پیر معروف حسین شاہ نوشاہی، آستانہ عالیہ نوشاہیہ بریڈفورڈ، ۶۸ ملین پاؤنڈ، ۱۵۰ ارب روپے تقریباً (پیر معروف حسین صاحب برطانیہ میں وارد ہونے والے سب سے پہلے پیر ہیں، موصوف اپریل ۱۹۶۱ میں برطانیہ تشریف لائے، اور اون کی مل میں مزدوری شروع کی، چند ماہ بعد بریڈفورڈ میں تبلیغ الاسلام کے نام سے ایک مکان میں مسجد بنائی، لیکن مریدین کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اگلے ۱۸ سال ملوں میں مزدوری ہی کرتے رہے، اس وقت بریڈفورڈ وگردونواح میں تیس سے زائد مکانات میں تبلیغ الاسلام کے نام سے مساجد بنا چکے ہیں، اور ان تمام پراپرٹیز کے بلاشرکتِ غیرے مالک بھی ہیں، لیکن ان مکانات کی مالیت ۶۸ ملین پاؤنڈ میں شامل نہیں، پیر صاحب اس لحاظ سے بھی بدقسمت ہیں کہ پاکستان میں کسی بڑی گدی کے سجادہ نشین نہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ میں ان کے مریدین کی تعداد ابھی تک بیس ہزار سے کم ہے)

۷۔ پیر سید عبدالقادر جیلانی سابق خطیب ٹینچ بھاٹہ راولپنڈی، مہتمم دار العلوم قادریہ جیلانیہ لندن، ۶۲ ملین پاؤنڈ، پاکستانی ۱۳۹ ارب روپے تقریباً

۸۔ پیر منور حسین جماعتی سجادہ نشین آستانہ علیہ امیر ملت پیر جماعت علی شاہ برمنگھم، ۶۰ ملین پاؤنڈ، پاکستانی ۱۳۴ ارب روپے تقریباً

۹۔ پیر حبیب الرحمن محبوب، سجادہ نشین آستانہ عالیہ ڈھانگری شریف، بریڈفورڈ، ۳۲ ملین پاؤنڈ، پاکستانی ۷۱ ارب روپے تقریباً

۱۰۔ پیر عرفان مشہدی، سجادہ نشین آستانہ عالیہ بکھی شریف بریڈفورڈ، پیر عرفان شاہ صاحب ان پیروں میں سب سے غریب ترین پیر ہیں کیونکہ ان کی دولت ۲ ملین پاؤنڈ یعنی پاکستانی صرف ۴۴ کروڑ روپے ہے۔

تلك عشرة كاملة

مندرجہ بالا تمام دس پیر صاحبان کا تعلق پاکستان وآزاد کشمیر سے ہے۔ جو برٹش نیشنلیٹی ہولڈر اور برطانیہ میں مقیم ہیں۔

طاہر القادری سمیت وہ تمام پیر صاحبان جنہوں نے اپنی دولت ٹرسٹ (این جی اوز) کے پردے میں چھپائی ہوئی ہے۔ وہ اس لسٹ میں شامل نہیں۔

نیز پاکستان میں مقیم جو پیر صاحبان سالانہ یہاں سے اربوں روپے کے نذرانے بٹورنے کے لیے تشریف لاتے ہیں وہ بھی اس لسٹ میں شامل نہیں۔

مندرجہ بالا دس پیر صاحبان کی اجتماعی دولت سے کئی گنا زیادہ دولت کے مالک "پیر ہاشم الگیلانی البغدادی" ہیں، جو آستانہ عالیہ شیخ عبدالقادر جیلانی رح بغداد کے گدی نشین ہیں، یہ پیر صاحب بھی برٹش نیشنلیٹی ہولڈر اور مقیم برطانیہ ہیں۔ جیسے پاکستانی نژاد برطانوی پیر کبھی کبھی پاکستان دورہ پہ تشریف لے جاتے ہیں، اسی طرح یہ بھی کبھی کبھی بغداد کے دورہ پہ تشریف لے جاتے ہیں۔

پس نوشت!!

آج ایک بڑے پیر صاحب کی لیٹسٹ ترین کار جس کی پاکستان میں مالیت دس کروڑ کے قریب ہے، بمپر پہ معمولی سکریچز ختم کروانے میرے پاس تشریف لائی (پیروں کی گاڑیاں بھی تو مقدس ہوتی ہیں نا) تو سوچا، ذرا غریب ترین پیر صاحبان کی دولت کا امیر مریدین کے سامنے پول کھولا جائے۔

❁❁❁

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل

ایسے ہوتے ہیں محبت نامے

تحریر: رضا علی عابدی

شاید آپ نے غور نہ کیا ہو۔ خط لکھنے کا رواج اٹھتا جا رہا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے جب ڈاکیہ صرف بجلی گیس اور پانی کے بل لایا کرے گا۔ ان کا بھی چل چلاؤ صاف نظر آ رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب خط کو آدھی ملاقات کہا کرتے تھے۔ یوں کہ اس میں پیار بھی ہوتا تھا، اور محبت بھی صرف آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا ممکن نہ تھا اس لئے اس کو آدھی ملاقات کہا کرتے تھے۔ مگر اس نسل اور قماش کے خط صفحۂ ہستی سے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ ہتھیلی پر دھرا ہوا اسمارٹ فون ہے یا واٹس ایپ ہے جس پر چھ سات بٹن دبایئے، نہ خیریت مطلوب ہے نہ دعائے خیر ہے، بس گفتگو شروع ہوگئی کہ گفتگو نہ ہوئی کاروبار ہوگیا۔ چنانچہ خط لکھنے، اس پر ٹکٹ چپکانے اور لیٹر بکس تک جانے پھر چھ سات دن جواب کا انتظار کرنے کی کھکھیڑ میں کون پڑے؟ ٹھیک ہے، یہی زمانے کا نیا چلن ہے پر اس چلن میں نہ وہ پیار کے میٹھے رس میں ڈوبے دو چار جملے رہے اور نہ وہ مٹھاس میں گھلے لطیف اور شگفتہ فقرے رہے۔ بڑا خسارہ ہے اور بہت بڑا۔ یہ ڈیجیٹل دور ہمارے زمانے کو اتنا سپاٹ، بے رنگ اور بے کیف بنا دے گا، ہمارے گمان میں نہ تھا۔

اپنے پچاس سال پرانے کاغذات میں سے احباب کے جو خط نکل رہے ہیں انہیں پڑھنے کے بعد دل کی وہی کیفیت ہوئی ہے جو اوپر بیان کر آیا ہوں۔ آج یاد تازہ ہوئی ہے اپنے محبوب دوست محمد عمر میمن کی جو رفاقت اور شفقت کی مثال بنے ہوئے تھے کہ دنیا سے سدھار گئے۔ پہلی بار لندن میں ملاقات ہوئی جس کے بعد ان کا یہ کہنا دل کو چھو لیتا تھا کہ ہم نے زندگی کے پچاس سال گنوا دیئے اور پہلے کیوں نہیں ملے۔ ان کا سنہ پچاس کا لکھا ہوا ایک ایک فقرہ محبت میں ڈوبا ہوا ہے، بس یہاں یہ بتا دوں کہ محمد عمر میمن کا تعلق بے حد پڑھے لکھے گھرانے سے تھا۔ امریکہ کی ایک یونی ورسٹی سے وابستہ تھے اور اردو کی ترویج کے لئے لاجواب کام کر رہے تھے۔ اردو ادب کے شاہ کاروں سے مغربی دنیا کو روشناس کرایا اور ایک اعلیٰ ادبی، تعلیمی اور تحقیقی مُجلّہ جاری کیا۔ دھیما سا مزاج تھا مگر کام شور انگیز کرتے تھے۔ ان کا خط پڑھیے، ایسے ہی خطوں کو کبھی محبت نامہ بھی کہا جاتا تھا:

۱۰ اگست ۱۹۹۵ء میڈیسن۔ امریکہ

برادرم عابدی صاحب الاندلس کا سفر، جھلسا دینے والی گرمی کے باوصف، ایک طرف عبرت انگیز اور دل گیر اور دوسری طرف اتنا ہی خوش گوار گزرا لیکن لندن میں آپ سے جو ملاقاتیں رہیں، ان کا اپنا الگ رنگ تھا: فالسائی مدھم، عجیب دل موہ لینے والی محبت کی آنچ سے مہکتا ہوا۔ مجھے تو گئے دنوں کا افسوس ہے، وہ پچاس سال جو ایک دوسرے سے لاعلمی میں گزرے۔ سچ، بھائی، آپ اور بھابی دونوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ مہمان نوازی، وہ احساسِ رفاقت، زندہ رہنے کے لئے اور کیا چاہئے۔

کل میں نے سالنامے کی ایک کاپی دفتر کے پتے پر سمندری ڈاک سے آپ کو بھیج دی ہے۔ ایک ماہ کے اندر پہنچ جائے گی۔ بھابی سے کہئے گا کہ میں نے شاید قرطبہ یا اشبیلیہ سے ہی اجمل کمال کو لکھ دیا تھا کہ آئندہ شمارے سے 'آج' اُن کے نام جاری کر دیں۔

یہاں پہنچنے کے دو دن بعد اجمل کمال کا ایک خط ملا جس کے لہجے کی اداسی اور مایوسی نے بے حد متوحش کیا۔ وہ بالغ نظر اور بڑے مضبوط ارادے کے آدمی ہیں لیکن کراچی کی موجودہ صورت حال نے انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک جملہ نقل کرتا ہوں: مکتبی دل چسپی کا سوال اب یہ ہے کہ موت پہلے آئے گی یا پاگل پن۔ جس قسم کے بدخواب دن رات دماغ میں چکراتے رہتے ہیں ان میں گوارا ترین یہ ہے کہ راہ چلتے گولی لگنے سے ہلاک ہو جائیں۔ باقی تمام صورتیں اس سے زیادہ بھیانک ہیں''۔

امید ہے میری کتاب رالف رسل نے اب تک آپ کو بھجوا دی ہو گی۔ بتایئے گا۔

بھئی رفاقت کا یہ جو سلسلہ قائم ہوا ہے، اسے جاری رہنا چاہئے۔ گاہے گاہے یاد کر لیا کیجئے گا۔ اب جب کہ میر صاحب آپ کی بزم میں چلے آئے ہیں اور میری بزم میں بھی۔ میں رالف رسل کو لکھ رہا ہوں کہ ''جرنیلی سڑک'' کے کون سے پڑاؤ مجھے پسند ہیں، وہ ترجمہ کر کے دیں گے تو ۱۹۹۶ کے سالنامے میں شائع کرنے کا پورا ارادہ ہے۔ یہ خط بھابی صاحبہ کو ضرور پڑھوا دیجئے گا اور میری طرف سے ان کی پر تپاک ملنساری کا شکریہ بھی ادا کر دیجئے گا۔ عبید صدیقی صاحب کو میری طرف سے سلام۔ میں جلد انہیں الگ سے خط لکھوں گا۔ آپ کا:

محمد عمر میمن

اور محبت میں ڈوبا ہوا یہ اگلا خط اپنا تعارف خود کرائے گا۔ حرف بہ حرف نقل کر رہا ہوں۔ پڑھئے اور سوچئے:

جناب رضا علی عابدی صاحب السلام علیکم

مزاج گرامی! آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتا ہوں۔ میں ۲۵ سال کا قیدی ہوں اور سنٹرل جیل ڈیرہ اسماعیل خان میں قید گزار رہا ہوں۔ پانچ سالوں سے میں بی بی سی کی خبریں باقاعدگی سے سنتا ہوں۔ اور آپ کے دورہ پاکستان آنے پر ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور آپ صاحب پاکستان کے کئی علاقوں مثلاً پشاور، پنڈی، کراچی، لاہور، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان کا دورہ کر رہے ہیں اور خاص کر ڈیرہ اسماعیل خان کا جب میں نے سنا تو ہم خوش ہوئے اور آپ صاحب جب ضلع ڈیرہ

اسماعیل خان کا دورہ کروگے تو نزدیک بالکل سامنے ۲ فرلانگ کے فاصلہ پر قائم سنٹرل جیل ڈیرہ اسماعیل خان کا دورہ بھی شامل کرلو۔ اور ہم بے حد مشکور ہوں گے۔ ہم ڈی آئی خان جیل کے دورے کی دعوت دیتے ہیں اور ہم قیدیوں کی خواہش ہے، ان شاء اللہ ہم کو امید ہے کہ آپ ڈی آئی خان کی بجائے ڈیرہ جیل کا دورہ بھی ضرور کریں گے۔ اور خاص کر قیدیوں سے گفتگو کریں گے۔ میں اپنا نام ظاہر نہیں کرتا کیونکہ یہ جیل ہے اور ان خطوں پر ہمیں سزا ملتی ہے۔ ہم آپ کے دورہ جیل کے لئے شکر گزار ہوں گے۔ (شکریہ)

والسلام آپ کا خیر اندیش، فقط قیدی بھائی مورخہ ۲۴-۳-۹۴

پھر کیا ہوا سن لیجئے۔ شام کو ڈیرہ اسماعیل خان کے عمائدین شہر سے ملاقات ہوئی نشست جمی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں قیدی بھائی کے اس خط کا ذکر آ گیا۔ جیل کے حکام بالا وہیں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ بس کل صبح آپ کو جیل کا دورہ کرایا جائے گا۔ اگلی صبح پہنچا تو میرے استقبال کی تیاری تھی۔ جیل کا دورہ شروع ہوا۔ قیدیوں کی ٹولیاں جگہ جگہ بیٹھی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ یہ رہے رضا علی عابدی۔ ان کو دورے کی دعوت کس نے دی تھی۔ کوئی نہ بولا۔ کئی بار پیار سے کہا گیا کہ بتاؤ کس نے بلایا تھا۔ سب خاموش رہے۔ میں نے بھی کچھ نہ کہا کہ کہیں کوئی قیدی بھائی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ پچیس سال ہو گئے۔ اگر وہ رہائی پا گیا (جیل سے) تو اسے میرا سلام پہنچے۔ اب تو کسی طرح اپنا نام بتادے۔

❁❁❁

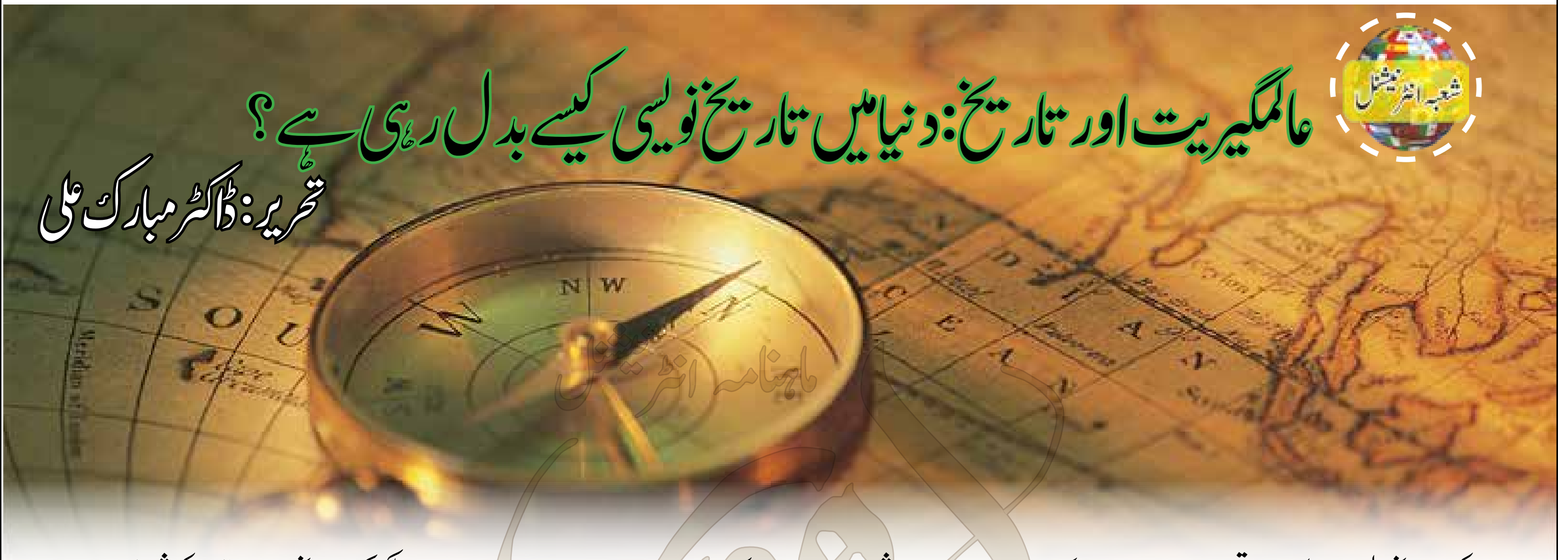

عالمگیریت اور تاریخ: دنیا میں تاریخ نویسی کیسے بدل رہی ہے؟

تحریر: ڈاکٹر مبارک علی

ہر عہد کی تاریخ نویسی جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کو پیش کرتی ہے۔ تاریخ نویسی کا تعلق سماج کے طاقتور طبقے سے بھی ہوتا ہے۔ عام لوگوں کو وہ تاریخ باہر رکھتی ہے اور ان کے کردار کو فراموش کر دیتی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب جمہوری روایات نے عوام کو حقوق دیئے تو تاریخ نویسی نے بھی اپنا دائرہ وسیع کر کے اس میں نچلے طبقوں کو شامل کر لیا۔ یورپ اور امریکا کے ابتدائی دور میں تعلیمی اداروں میں یونانی اور رومی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔ خاص طور سے رومی سلطنت کی سماجی و سیاسی تاریخ اور لاطینی زبان کا سیکھنا لازمی تھا مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں میں لیڈر شپ کے جذبات پیدا ہوں۔ لاطینی زبان کے ادب میں انہیں ورجل، جولیس سیزر اور سائیسیرو کی کتابوں کے اقتباسات پڑھائے جاتے تھے۔ رومی تاریخ اور لاطینی زبان موجودہ زمانے تک نصاب کا حصہ رہی۔

تاریخ نویسی میں اس وقت تبدیلی آئی، جب اسے قوم پرستی کے زیر اثر لکھا جانے لگا۔ امریکا میں خاص طور پر یورپ کی تاریخ کو اہمیت دی جانے لگی۔ جب قومی تاریخ لکھنے کی ابتداء ہوئی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ تاریخ کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ لہٰذا کلچرل تاریخ نے تاریخ نویسی کو نئے موضوعات دیئے۔

تاریخ نویسی میں فیمینسٹ نقطہ نظر

سن ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تحریک نسواں نے تاریخ نویسی میں فیمینسٹ نقطہ نظر کو شامل کیا۔ جان سکاٹ نے 'جینڈر اینڈ ہسٹری' لکھ کر تاریخ میں عورتوں کی شمولیت اور ان کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس دور میں لکھی جانے والی دو کتابیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے ایک پی تھامسن کی 'دا میکنگ آف انگلش ورکنگ کلاس' اور دوسری البرٹ ماریس سبول کی 'ساں کلوٹ' ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مارکسی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں لیکن انہوں نے معیشت کے بجائے کلچر کو اہمیت دیتے ہوئے مزدوروں اور عوام کی تاریخ لکھی ہے۔

تاریخ نویسی اور عالمگیریت

تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلی اس وقت آئی، جب اس میں عالمگیریت کے نقطہ نظر کو شامل کیا گیا۔ اگرچہ عالمگیریت کے لفظ کا استعمال ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہوا مگر اس کی مختلف شکلیں ماضی میں پائی جاتی ہیں، جیسے بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تبلیغ، جس میں مختلف اقوام کو ان مذہبوں میں شامل کر کے ان کو وسعت دی گئی۔ عالمگیریت کو ہم بڑی سلطنتوں کے قیام میں بھی دیکھتے ہیں، جیسے رومی سلطنت، عربوں کی فتوحات، عثمانی خلافت کا عروج اور یورپی سامراجوں کا پھیلاؤ۔ لیکن موجودہ دور میں جب سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے دنیا کی اقوام میں روابط اور رشتے بڑھے تو ان میں افہام و تفہیم پیدا ہوئی

❁❁❁

مسلمانوں کے تخلیقی اذہان کی مغرب منتقلی (برین ڈرین)

تحریر: غزالی فاروق

چند دن قبل امریکی خلائی تحقیق کے ادارے ناسا (NASA) نے خلائی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا جب اس نے مریخ کی سطح پر ایک چھوٹے ہیلی کاپٹر کو کامیابی سے پرواز کرایا۔ یہ بجلی کی مدد سے ہونے والی پہلی اڑان تھی جسے ۲۲۵ ملین کلومیٹر دور کسی دوسرے سیارے سے کنٹرول کیا جارہا تھا۔ انجینئر لوئے الباسیونی نے اس عظیم سائنسی پیشرفت میں نمایاں ترین کردار ادا کیا جو فلسطین کے علاقے غزہ کی پٹی میں پل بڑھ کر جوان ہوئے جس پر اسرائیل اس وقت بھی کھل کر بمباری کر رہا ہے۔

لوئے الباسیونی یونیورسٹی کی تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ گئے۔ انہوں نے ایرو سپیس کمپنی، انجنیوٹی میں ملازمت اختیار کی جس نے انہیں ناسا کے ایک تجرباتی منصوبے کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی جس کے تحت مریخ پر پرواز کرنے کے لیے ایک طیارہ بنانا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر لوئے اور اس کے ساتھیوں کے خیالات، تصوراتی دستاویزات اور تعمیراتی کوششوں سے تیار ہوا۔ لوئے نے انجنیوٹی کے الیکٹریکل اور پاور الیکٹرانکس لیڈ کے طور پر کام کیا، جس میں پروپلشن سسٹم کی ذمہ داری بھی شامل ہے۔ اس میں موٹر کنٹرولر، انورٹر، سروو کنٹرولر، موٹر، اور سگنلنگ سسٹم کی ڈیزائننگ شامل تھی۔ دنیا نے ہیلی کاپٹر کی خبر میں بہت دلچسپی لی جسے ناسا نے مریخ پر بڑے جوش وخروش سے لانچ کیا تھا۔ ناسا نے اسے مریخ کے منصوبے میں ایک بڑی کامیابی قرار دیا۔ اس حوالے سے یہ بات جلد ہی واضح ہوگئی کہ ہیلی کاپٹر کے پیچھے تخلیقی ذہن اسلامی امت کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا ہے۔

اسی تناظر میں، مشہور غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ (GIKI) آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے تعلق رکھنے والے پاکستانی طلباء کی ایک ٹیم نے ایروناٹکس اینڈ ایسٹرونوٹکس (Aeronautics & Astronautics) میں میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) اور اسٹین فورڈ یونیورسٹی کو شکست دی۔ ان طلباء نے دونوں تعلیمی اداروں کے طلباء کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے نے بھی طیاروں اور فلائٹ ڈیزائن اور تعمیر کے مقابلے میں ایم آئی ٹی (MIT) اور اسٹین فورڈ کے خلاف عمدہ کارکردگی پر ان طلباء کی تعریف کی۔

تخلیقی ذہنوں کی مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی جانب منتقلی کا مسئلہ جسے اصطلاح میں برین ڈرین (brain drain) بھی کہا جاتا ہے، اُمت کو اس وقت سے اپنی پوری شدت کے ساتھ درپیش چلا آرہا ہے جب سے اُمت کی آخری نظریاتی ریاست، خلافت عثمانیہ کی صورت میں اختتام پذیر ہوئی۔ بصیرت رکھنے والے کسی شخص کے لئے بھی یہ بات راز نہیں کہ تخلیقی اذہان کی یہ منتقلی مسلمانوں کے علاقوں میں سیاسی ابتری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بدحالی کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ قابل ترین مسلمان سائنس اور علم کے مختلف شعبوں میں اپنے تخلیقی ذہنوں کو بروئے کار لانے کے مواقع کی تلاش میں مغرب کی جانب منتقل ہوجاتے ہیں۔ جبکہ مسلم علاقوں میں موجود حکومتوں کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو امت کی دولت سے اپنی جیبیں اور بینک کھاتوں کو بھرتی ہیں یا پھر اپنے مغربی آقاؤں کے آگے اُمت کے بیش بہا وسائل، معدنیات اور دولت کو پیش کر دیتی ہیں جسے مغربی ملٹی نیشنل کمپنیاں سستے داموں لوٹ کر لے جاتی ہیں۔ پھر مغرب کی جانب سے مسلمانوں کو انہی کے لٹے ہوئے وسائل پر مبنی اشیاء کئی گنا مہنگے داموں پر واپس فروخت کی جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم مسلم دنیا سے مغربی دنیا میں منتقل ہونے والے اسلامی اذہان کے اعداد وشمار دیکھتے ہیں تو حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ترقی پذیر ممالک سے مغربی ممالک کی جانب دماغ کی منتقلی کا ایک تہائی حصہ صرف عرب ممالک کی جانب سے ہے۔ عرب ممالک کے ۵۰ فیصد ڈاکٹر، ۲۳ فیصد انجینئر اور ۱۵ فیصد سائنسدان یورپ، امریکہ اور کینیڈا کی جانب منتقل ہوجاتے ہیں۔ برطانیہ میں اس وقت جتنے بھی ڈاکٹرز موجود ہیں ان میں سے ۳۴ فیصد کا تعلق صرف عرب ممالک سے ہے۔ عرب ممالک سے بیرون ملک منتقل ہونے والے لوگوں میں سے ۷۵ فیصد امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں جاتے ہیں۔ اعداد و شمار یہ بھی بتاتے ہیں کہ امریکہ کی جانب سے عراق پر کڑی پابندیاں (sanctions) عائد کیے جانے کے نتیجہ میں ۱۹۹۱ سے لے کر ۱۹۹۸ کے عرصہ میں ۷،۳۵۰ عراقی سائنسدانوں نے مغرب کی جانب منتقلی کی۔ اسی طرح عراق پر امریکی قبضہ کے پہلے تین سالوں میں یعنی ۲۰۰۳ سے ۲۰۰۶ کے عرصہ میں عراقی یونیورسٹیوں کے ۸۹ پروفیسروں کو موت کی گھاٹ اتار اگیا۔ عرب لیبر آرگنائزیشن (Arab Labor Organization) کے مطابق ۲۰۰۴ سے لے کر ۲۰۱۳ کے دس سالہ عرصہ میں صرف دنیائے عرب کے ۴۵۰،۰۰۰ گریجویٹس امریکہ اور یورپ کی جانب منتقل ہوئے۔ مزید یہ کہ بیرونی ممالک میں اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے عرب طلباء میں سے آدھے سے زیادہ طلباء تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس نہیں لوٹتے۔ جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو مغربی ممالک میں بسنے والے پاکستانیوں کی تعداد بھی بے انتہا زیادہ ہے۔ ذرائع کے مطابق صرف ۲۰۱۳ میں تین لاکھ سے زیادہ پاکستانی جو کہ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور ماہرین پر مشتمل تھے، کام کی خاطر بیرون ملک روانہ ہوئے۔ حال ہی میں فرانس کے جنوبی شہر مارسیل کے ایک طبی مرکز کے دورے کے موقع پر جب فرانس کے صدر میکرون نے مرکز کی لیبارٹریوں میں ڈاکٹروں سے ان علاقوں کے بارے میں پوچھا جہاں سے وہ آئے ہیں تو وہ متعدد ماہرین کے جوابات سے حیران رہ گیا جنہوں نے کہا: "میں الجزائر سے ہوں"، "میں تیونس سے ہوں"، "میں لبنان سے ہوں" اور "میں فلاں مسلم علاقے سے ہوں" وغیرہ۔

یہ اور ایسے تمام اعداد وشمار اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ پاکستان سمیت دیگر مسلم ممالک

کے حکمران اپنے علاقوں میں سائنس اور اس جیسے دیگر علوم سے متعلق خاطر خواہ مواقع پیدا کرنے میں پوری طرح سے ناکام رہے ہیں۔اس میں ان مسلمانوں کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا جو بہتر مواقع کی تلاش میں بیرون ملک منتقل ہوئے کیونکہ یہ انسان کی جبلت بقاء کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تگ ودو کرتا ہے۔لیکن اگر اس کا سامان اپنے ملک میں ہی پیدا کر دیا جائے تو کسی کو بیرون ملک منتقل ہونے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

پھر ان مغرب نواز مسلم حکمرانوں کے علاوہ مغرب کی مسلم ممالک سے متعلق خود اپنی پالیسیاں بھی مسلمانوں کی پسماندگی کی بڑی وجہ ہیں۔امریکا خطرناک ہتھیاروں کے ذریعے اس یہودی وجود کی حمایت اور سرپرستی کرتا ہے، جس وجود کو اس ہیلی کاپٹر کے مسلم (لوئے الباسیونی) کے خاندان اور لوگوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔مغربی دنیا، جس کی سربراہی امریکا کر رہا ہے، اس میں انڈسٹری، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور طب کے شعبوں میں مسلمانوں کے انتہائی قابل بیٹوں اور بیٹیوں نے یونیورسٹیوں میں اپنے تحقیقی کاموں کے ذریعے ہزاروں کارنامے انجام دیے ہیں۔لیکن اس کے باوجود، بدلے میں مغرب پوری دنیا میں مسلمانوں پر حملہ آور ہے اور ان کا قتل وغارت جاری رکھتا ہے۔

انجینئر، لوئے البسیسوانی اور غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ کے طلباء کی ٹیم، ایسی بے شمار مثالوں میں سے محض صرف دو مثالیں ہیں۔امت کی قابلیت اور صلاحیتیں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔اس کو صرف ایک اسلامی نظریاتی ریاست کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس کی وسیع قابلیت کو اُمت مسلمہ اور ساری انسانیت کے حق میں استعمال کرے۔ان صلاحیتوں کو ایک ایسی اسلامی ریاست کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جو خلائی تحقیق کے میدان میں بھی سب سے آگے ہو اور لوگوں کی زندگی کو راحت بخشتے ہوئے اسے محفوظ بنا کر لوگوں کو مطمئن بھی کرے، بجائے اس کے کہ اُمت کی صلاحیتیں ضائع ہوں اور ہنرمند مسلمان اس مغربی تہذیب کے مفاد کے لئے استعمال ہوں جو انسانیت کو تکلیف پہنچاتی ہے۔

ماضی میں ہیولٹ پیکارڈ (HP) کی سی ای او (CEO) کارلے فیورینا (Carly Fiorina) نے ۲۰۰۱ میں تبصرہ کیا تھا،"ایک زمانے میں ایک ایسی تہذیب تھی جو دنیا کی سب سے عظیم تہذیب تھی۔۔۔اور کسی بھی اور چیز کے مقابلے میں ایجادات اس تہذیب کو آگے لے کر گئیں۔اس کے معماروں نے ایسی عمارتیں ڈیزائن کیں جو کشش ثقل کے اثر سے آزاد تھیں۔اس کے ریاضی دانوں نے الجبرا اور الگورتھم تخلیق کیے جو کمپیوٹر کی تعمیر اور انکرپشن (Encryption) کا باعث بنے۔اس کے ڈاکٹروں نے انسانی جسم کا معائنہ کیا، اور بیماری کے نئے علاج ڈھونڈے۔اس کے ماہرین فلکیات نے آسمانوں کی طرف دیکھا، ستاروں کو نام دیا، اور خلائی سفر اور تلاش کی راہ ہموار کر دی۔۔۔جس تہذیب کی میں بات کر رہی ہوں وہ ۸۰۰ سے ۱۶۰۰ عیسوی تک کی اسلامی دنیا تھی، جس میں سلطنت عثمانیہ اور بغداد، دمشق اور قاہرہ کی عدالتیں اور سلیمان عظیم جیسے روشن خیال حکمران شامل تھے"۔ ❀❀❀

مغرب میں اسلاموفوبیا

تحریر: محمد شعیب عادل

ڈان اخبار نے اپنی ۲۹ جون کی اشاعت میں کینیڈا سے متعلق ایک خبر شائع کی ہے جس کے مطابق "کینیڈا کے ایک صوبے میں ایک پاکستانی جس نے مسلمانوں کا روایتی لباس پہن رکھا تھا اس پر دو اشخاص نے چاقو سے حملہ کیا اور کہا کہ تم کون ہو اور ایسا لباس کیوں پہن رکھا ہے۔زخمی ہونے والے نے یہ بھی کہا کہ تم نے داڑھی کیوں رکھی ہوئی" وغیرہ وغیرہ۔خبر کے مطابق اس نے یہ بھی کہا کہ اسے اپنی فیملی کی بھی فکر ہے کہ کہیں انہیں بھی نشانہ نہ بنایا جائے۔حسب معمول پاکستانیوں نے اسے اسلاموفوبیا قرار دینا شروع کر دیا ہے۔خبر کے مطابق اس شخص نے مسلمانوں کا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔۔۔سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا کوئی روایتی لباس ہے؟ لباس کا تعلق تو علاقے سے ہوتا ہے۔ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے تمام افراد، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، کا لباس اپنے علاقے کے رہن سہن کے مطابق ہی ہوتا ہے۔اسی طرح عرب کے رہنے والے ہوں یا افریقہ کے باسی۔ یورپ میں رہنے والے مسلمان ہوں یا مسیحی، سب کا لباس بھی ایک سا ہوتا ہے۔میں ستر اور اسی کی دہائی میں یورپ جانے والی کچھ فیملیز کو جانتا ہوں کہ جو پاکستان میں تو پردہ کرتی تھیں لیکن یورپ یا مغربی ممالک جاکر پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ان خواتین نے یورپی ممالک کے قوانین کے مطابق مختلف جگہوں پر ملازمت کے حصول کے لیے انٹرویو سمیت کسی بھی ٹیسٹ میں حجاب یا برقعے میں ملبوس ہونے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔پاکستان میں بھی خواتین آہستہ آہستہ روایتی حجاب یا برقعہ پہننے کو ترک کرنا شروع ہو گئیں تھیں۔اس کی واضح مثال تو ہماری اپنی فیملی کی ہے۔اگر آپ ۶۰، ۷۰ حتیٰ کہ ۸۰ کی دہائی کی پنجاب یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں لگی گروپ فوٹو دیکھیں اور آج کے دور کے گروپ فوٹو سے موازنہ کریں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔آج تقریباً ہر لڑکی حجاب اور برقعے میں ملبوس نظر آئے گی۔

یہ سب برکات جہاد افغانستان کی دین ہیں۔جب پاکستانی ریاست نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے افغانستان میں قتل وغارت کو جہاد کا نام دیا۔جہاد کے لیے افرادی قوت حاصل کرنے کے لیے ہر محلے میں سعودی پیسے سے مدرسے بننے شروع ہو گئے جہاں مذہبی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ سلفی کلچر کی آمد بھی شروع ہوئی۔پاکستانیوں یا کسی بھی علاقے کے روایتی لباس سے نفرت کا اظہار کیا گیا اور مذہب کے نام پر سلفی کلچر کو پروموٹ کیا گیا۔اس سلفی کلچر نے سماجی سطح پر پوری دنیا میں تباہی پھیلائی ہے۔نائن الیون کے بعد جب جہادی پوری دنیا میں پھیل گئے تو انھوں نے سلفی کلچر کو بھی یورپ میں سیکولرازم کی آڑ میں بطور سیاسی ایجنڈا پروموٹ کرنا شروع کیا۔جہاں پہلے لوگ اپنے گھروں میں چپکے سے نماز پڑھ لیتے تھے وہاں اب عوامی جگہوں پر نماز پڑھنے کا رواج ڈالا گیا۔خواتین نے اصرار کیا کہ وہ دوران ملازمت حجاب یا برقعے میں ملبوس ہوں گی۔یورپ خاص کر یوکے میں تو مسلمان سیکولرازم کی آڑ لے کر اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ وہ کھلے عام یورپی تہذیب کو نہ صرف برا بھلا کہتے ہیں بلکہ شریعت نافذ کرنے کے مطالبات کرتے نظر آتے ہیں۔اس طرح کی حرکتوں کے ردعمل میں یورپ میں مسلمانوں سے نفرت کا آغاز ہوا۔اب اگر کوئی ان کی حرکتوں پر طعنہ زنی کرے یا نفرت کا نشانہ بنائے تو اسے جھٹ سے اسلاموفوبیا قرار دے کر مظلومیت کا رونا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ❀❀❀

کرونا کے دنوں میں محبت

تحریر: عاتکہ رحمان ۔ ترجمہ: لیاقت علی

دسمبر ۲۰۱۹ میں نور سجاد ظہیر جواہر لعل یونیورسٹی دہلی کے کیمپس میں تھیں جب انھیں لندن میں مقیم یاور عباس کی ٹیلی فون کال آئی تھی۔ 'میں ایک مظاہرے میں شریک ہوں۔میرے ارد گرد بہت شور ہے۔کیا ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں؟'' کیا آپ (مظاہرین سے) چند منٹ کے لئے تھوڑا دور جا سکتی ہیں۔میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں' یاور عباس نے فون پر کہا۔کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'نور سجاد ظہیر کے لئے اتنی دور سے موصول ہونے والی شادی کی یہ تجویز حیران کن نہیں تھی۔

بائیں بازو کے نظریات کی حامل مصنف، دانشور اور عورتوں کے حقوق اور آزادی کی پر جوش علم بردار نور ظہیر کے لئے جواہر لعل یونیورسٹی میں جاری مظاہرہ اس کی زندگی بھر کی جد وجہد کا حصہ تھا۔نور ظہیر اپنے نظریات کے اظہار میں انتہائی نڈر، صاف گو اور بے باک سمجھی جاتی ہیں۔تاہم جس بات نے ان کے دوست احباب کو حیران اور ششدر کیا وہ یہ تھی کہ ان سے شادی کرنے کے خواہش مند شخص کی عمر کم و بیش سو سال تھی۔

چند ماہ بعد نور ظہیر بھارت سے، جہاں انھوں نے اپنی ساٹھ سال سے زائد عمر کا زیادہ تر حصہ گذارا تھا یاور سے شادی کرنے کے لئے انگلستان چلی گئیں۔مارچ ۲۰۲۰ میں جب انھوں نے ان دونوں نے شادی کی تو پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا نے اسے شہ سرخی بنایا۔ایک ایسے وقت میں جب کرونا کے باعث لاکھوں افراد مایوسی، تنہائی اور ذہنی دباؤ کا شکار تھے نور ظہیر اور یاور عباس کی شادی خوشی اور مسرت کی خبر بن گئی۔

شادی کے ایک سال بعد گذشتہ ہفتے جب میں انھیں جنوب مغربی لندن میں واقع ان کے اپارٹمنٹ میں ملی تو یاور اور نور محبت کی شادی سے جنم لینے والی کامل مسرت اور سرشاری کی مجسم تصویر نظر آئے۔ گو ان کی شادی کو ایک سال بیت چکا ہے لیکن ان کی ایک دوسرے سے محبت کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھ رہی ہے۔ٹوکری میں تازہ پھول رکھے ہوئے تھے جو یاور نور کے لئے لے کر آئے تھے کیونکہ 'نور کو یہ بالکل یاد نہیں کہ یاور کسی کام سے گھر سے باہر گئے ہوں اور اس (نور) کے لئے کوئی چھوٹا سا تحفہ نہ لے کر آئے ہوں'۔ یاور جانتے ہیں کہ نور کو ڈینش پیسٹریز پسند ہیں۔

سال گذشتہ انھوں نے طویل واک کرتے، کتابیں پڑھتے، لکھتے اور فلمیں دیکھ کر گذارا۔ جب سے انگلستان میں کووڈ ۱۹ کی بدولت عائد پابندیاں ختم ہوئی ہیں انھوں نے دوست احباب سے میل جول شروع کیا ہے گذشتہ سال ان کی شادی کے موقع پر ان کے ایک دوست نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ 'شادی کے موقع پر وہ کس قدر خوش تھے، نوجوان شادی شدہ جوڑوں سے بھی زیادہ'۔میرے پاس ان دونوں سے پوچھنے کے لئے بہت سے سوالات تھے۔آخر وہ کونسی بات تھی جس نے انھیں اس پیرانہ سالی میں شادی کرنے پر آمادہ کیا تھا؟اور اس سے بھی اہم سوال نور ظہیر سے تھا کہ ایک سو سال کے بوڑھے شخص سے شادی کرنا مشکل فیصلہ تھا؟

فلم میکر اور صحافی یاور عباس کا تعلق بھارت کی ریاست اتر پردیش کے دارالحکومت لکھنو سے ہے۔ انھوں نے برٹش انڈین آرمی سے بطور فوٹو گرافر اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور انھیں برما میں تعینات کیا گیا تھا۔ جب جاپان نے ۱۹۴۵ میں اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالے تو اس ایونٹ کی تصاویر بنانے والے فوٹو گرافرز میں یاور عباس بھی شامل تھے۔ وہ بی بی سی اردو سروس کے ساتھ ۱۹۵۰ سے ۲۰۰۹ کے درمیانی سالوں میں وقفے وقفے سے وابستہ رہے۔ یاور اور نور کے اپنے اپنے بچے ہیں۔نور کی ان کے مرحوم شوہر ابھیشیک سے تین بیٹیاں ہیں جب کہ یاور کے بھی بچے ہیں۔ ان کی بیوی ۱۲ سال قبل وفات پا گئی تھیں۔

نور اور یاور کی گذشتہ سال الہ آباد یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے کہانی فیسٹول میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ یاور نے اس کہانی میلے میں بطور مقرر شرکت کی تھی۔ یاور عباس نے نور ظہیر کی کتابوں پر گفتگو کی تھی۔سیشن کے اختتام پر انھیں ایک دوسرے سے گفتگو کا موقع ملا تھا۔ 'لٹریچر کی حد تک میں نے انھیں بہت با علم پایا' نور نے اپنی پہلی ملاقات کا تاثر بتاتے ہوئے کہا۔ 'اردو ادب میں تنقید عملی طور پر مفقود ہے۔۔۔ جو ہے وہ مستعار ہے۔' جنوبی ایشیا میں اس (تنقید) کا ارتقا نہیں ہوا۔لیکن (یاور اس

حوالے سے) بہت اوریجنل تھے۔ وہ تنقید کے سبھی ازموں سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور کھلے ذہن سے چیزوں کا تقابل کرتے تھے۔ اردو شاعری سے ان کی واقفیت بھی متاثر کن تھی‘ الہ آباد میں ہماری ملاقات اگرچہ بہت مختصر رہی لیکن اسے آپ دوستی کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔

وقتاً فوقتاً ای میلز کا تبادلہ ہوتا رہا اور یاور جب بھی بھارت آتے تو نور کو ٹیلی فون ضرور کرتے تھے۔ دونوں کے مابین تعلق اس وقت مضبوط ہوا جب اکتوبر ۲۰۱۹ میں نور ظہیر کو فیض امن میلہ میں بطور مقرر شرکت کے لئے لندن مدعو کیا گیا تھا۔ نور کے لندن پہنچنے سے قبل یاور نے فیض میلہ کی انتظامی کمیٹی جس کے پاس فنڈز بہت محدود تھے، کو مطلع کر دیا تھا کہ نور ان کے ہاں قیام کریں گی۔ اور نور نے لندن قیام کے دوران یاور کے ہاں ہی قیام کیا تھا۔ ’یہی وہ موقع تھا جب ہم ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ ہمارے مابین طویل گفتگو کے کئی سیشن ہوئے۔ یاور نے اپنی فلموں بارے بتایا جو میں نے ان سے ملاقات سے قبل دیکھی تو تھیں لیکن تسلسل سے نہیں دیکھی تھیں۔ ہم ہر رات اکٹھے ان کی بنائی فلمیں دیکھتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم دیکھتے ہوئے یاور سو جایا کرتے تھے۔ لندن کا یہی دورہ نور اور یاور کے مابین گہرے تعلق کا باعث بنا تھا اور اسی بنا پر نور نے مہینوں بعد جواہر لعل یونیورسٹی کیمپس میں ہونے والے مظاہرے میں شرکت کے دوران یاور کی طرف سے ٹیلی فون پر شادی کی پیش کش کو قبول کر لیا تھا۔ ’میں حقیقی معنوں میں یاور کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ ۲۰۱۹ کے وہ سات دن جو میں نے اپنے قیام لندن کے دوران یاور کے ساتھ گذارے تھے، کے دوران میں نے یاور کو بہت تنہا پایا تھا۔ وہ بہت کچھ بتانا اور شیئر کرنا چاہتے تھے لیکن یہ سب کچھ بتانے اور شیئر کرنے کے لئے کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اور یہی وہ بات تھی جس نے مجھے یاور کی شادی کی پیش کش کو منظور کرنے پر مائل کیا تھا‘ ان کے مابین تعلق بھارت میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر بحث و تمحیص کے دوران قائم ہوا تھا۔

جب سے مودی حکومت برسر اقتدار آئی تھی وہ بہت اداس تھے۔ اور تو اور ان کی ای میلز بھی اداسی کا رنگ لئے ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب مودی برسر اقتدار ہے میں بھارت نہیں آوں گا۔ مودی حکومت کی پالیسوں اور نور کی طرف سے ان کی مخالفت کی بنا پر انھیں بہت سی مشکلات اور مسائل کا سامنا تھا۔ اگست ۲۰۱۹ میں جب مودی سرکار نے کشمیر کو خصوصی سٹیٹس سے محروم کیا تو نور نے اس کی بھرپور مخالفت کی تھی جس کی بنا پر مودی سرکار نور کے خلاف بڑی سرگرمی سے متحرک ہو گئی تھی۔ یہی وہ صورت حال تھی جس میں نور نے بھارت چھوڑ کر لندن میں یاور کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بھارت میں ان کی زندگی کو مشکل بنا دیا گیا تھا بالخصوص اس رپورٹ کے بعد جو انھوں نے آل وویمن فیکٹ فائینڈنگ گروپ کے رکن کے طور پر کشمیر میں لاک ڈاون کے دوران انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں تیار کی تھی۔ کشمیر رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد بھارت میں میرے لئے بہت مشکل صورت حال پیدا ہو چکی تھی اور مجھے سیاسی طور پر ہراساں کیا جا رہا تھا۔ جب یاور نے شادی کی پیش کش کی تو پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ انگلستان میں وہ کریں گی کیا۔ میں حال ہی میں سارک کے کلچرل کو آرڈی نیٹر کی حیثیت سے ریٹائیر ہوئی تھی۔ اور یہ بھی سوال درپیش تھا کہ میں برطانوی معاشرے میں مستقل طور پر خود کو ایڈجسٹ کر پاوں گی؟ مجھے اس بات نے سوچنے پر راغب کیا کہ میں انگلستان میں رہتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق ایسا کچھ کر سکتی ہوں جس کی بدولت عوام اپنے ارد گرد ہونے واقعات اور درپیش صورت حال کے بارے میں سوالات اُٹھا سکیں۔

گذشتہ سال نور نے یاور کی خود نوشت لکھنے میں مدد کی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ ان کہانیوں کو فوکس کریں جو وہ لوگوں سنانا اور بتانا چاہتے ہیں اور ان چیزوں کی فہرست مرتب کریں جن کو جاننے میں ان کے خیال میں لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ انھیں شاعری اور فلم سے محبت ہے لیکن ان کی دوسری چیزوں بارے بھی جانتی ہوں۔ ان کی پسند ناپسند، ان کے دوست، ان کے رومانس، ہم ہر چیز بارے گفتگو کرتے ہیں میں ایک انسان کے طور پر انھیں پسند کرتی ہوں‘ نور اور یاور دونوں کی صحت بہت اچھی ہے اور بہت متحرک ہیں۔ ’وہ واک کرنا پسند کرتے ہیں ابھی تک ڈرائیونگ کرتے ہیں اور بوڑھے لگتے تو وہ بالکل بھی نہیں ہیں‘ نور کہتی ہیں کہ یاور میں حس مزاح بہت زیادہ ہے جو ان کے لئے ان کی خوبصورتی اور دماغ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ خود پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے ہیں‘ ہم نے شادی بطور انسٹی ٹیوشن کے بارے میں گفتگو کی۔ ہم نے ملالہ کے اس انٹرویو جس میں اس نے شادی بارے سوال اٹھایا تھا، پر بھی تبادلہ خیال کیا جس پر پاکستان میں بہت شدید ردعمل سامنے آیا تھا۔

نور کہتی ہیں کہ ملالہ کچھ بھی کہے اس کے خلاف قدامت پسند اور رجعتی حلقوں کا ردعمل اچنبھا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ یہ بھی کہتی کہ وہ شادی کر رہی ہے تو اس پر ان حلقوں کا ردعمل منفی ہوتا۔ شادی کے بارے بات کرتے ہوئے نور نے کہا کہ اچھا یا بُرا کے الفاظ قورمے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ شادی کے بارے میں۔ ’ایک تعلق آپ کو خوشی دیتا ہے یا یہ نہیں دیتا‘۔ یاور جو بہت رومانٹک ہیں ’فطرت نے ہم دونوں ہمیں ایک دوسرے قریب لانے کے لئے سازش کی تھی۔ میں شادی بارے نہیں سوچ رہا تھا۔ میری پہلی بیوی بہت سال قبل فوت ہو چکی تھی اگر مجھے شادی کرنا ہوتی تو یہ کام کئی سال پہلے کر چکا ہوتا۔ نور کے ساتھ شادی تو فطری مجبوری تھی۔ میں نور کے ساتھ بہت خوش ہوں‘ یاور نے کہا۔

نو بیاہتا جوڑے نے جب مجھے خدا حافظ کہا تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ چند اب سے چند سال بعد نور اکیلی ہو سکتی ہیں لیکن اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی انھوں نے یاور سے شادی کی ہے۔ ’میرا ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ اگر زندگی میں ایک دن بھی اچھا ملے تو اسے بھرپور طور گذارنا چاہیے‘

تہذیب یافتہ سینما کا عہد تمام ہوا

تحریر: خرم سہیل

ان کے کرداروں کی خوشبو سے پاک و ہند کا فلمستان مہکتا رہے گا اور مغل اعظم جیسی فلم آنے والوں کو بتائے گی کہ تہذیب یافتہ سینما کیا ہوتا ہے۔ فلم کی کہانیوں میں زبان کی چاشنی وسلاست اور لہجے کی شیرنی ایک ساتھ گھلی دیکھنی اور محسوس کرنی ہو تو دلیپ کمار کو گفتگو کرتے دیکھیے۔ وہ کوئی ادیب یا قلم کار بھی نہ تھے مگر ان کے ہاں زبان کی تہذیب اس قدر زرخیز ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ وہ اردو بولیں یا انگریزی، گفتگو کے بامِ عروج پر ہوتے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ انہیں پنجابی، پشتو، مراٹھی، بنگالی، گجراتی، ہندکو، فارسی، اودھی اور بھوجپوری زبانوں پر بھی دسترس تھی۔ برِصغیر پاک و ہند میں ادبی روایات اور طلسماتی اداکاری کا یہ زریں باب اختتام پذیر ہوگیا۔ بقول غالب

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

برِصغیر کے سینما کی تاریخ میں ۱۹۱۳ء میں دادا صاحب پھالکے کی بنائی ہوئی فلم 'راجہ ہریش چندر' ہو، جو برِصغیر کی پہلی خاموش فلم تھی، یا پھر ۱۹۳۱ء میں ریلیز ہونے والی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' ہو۔ غیر منقسم ہندوستان میں ان فلموں نے سینما کے زریں عہد کا آغاز کیا۔

اس خطے کی فلمی تاریخ میں ۱۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت گیا، فلمیں بن رہی ہیں، فنکار اور ہنرمند اس میں اپنی صلاحیتیں آزما رہے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے سینما میں اگر ہم کسی پہلے سپر اسٹار کو تلاش کریں تو ہماری نگاہیں صرف ایک ہی اداکار پر جاکر ٹھہرتی ہیں جنہوں نے حقیقی معنوں میں سپر اسٹار کا مقام حاصل کیا اور جو برِصغیر پاک و ہند کے فلمی منظر نامے پر

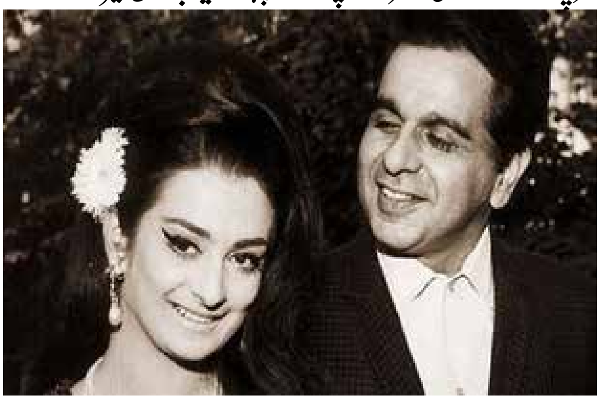

چھائے رہے، ان کا نام محمد یوسف خان ہے، جنہیں فلمی دنیا دلیپ کمار کے نام سے جانتی ہے۔ ایک ایسا اداکار جس کی یہ عادت تھی کہ جب بھی وہ اپنے لیے کسی کردار کو منتخب کرتا تو سب سے پہلے اس کردار کی نفسیات کو پرکھتا، اس کے جذبات کی تہہ میں اترتا، اس کو اپنے اوپر طاری کرتا، پھر اسے برقی آنکھ کے سامنے کچھ اس طرح ادا کرتا کہ وہ کردار فلم بینوں کے دل میں اتر جاتا اور اذہان میں نقش ہوجاتا۔ ایسے کئی کردار فلمی تاریخ میں بکھرے ہوئے ہیں، جن کو اس فنکار نے ادا کیا اور آگے بڑھ گیا، لیکن وہ کردار اس کی انگلی تھامے، اس کے ہمراہ جانے کی خواہش میں فلم بینوں کے دلوں میں رچے بسے رہے۔ شاید کچھ ایسے کردار بھی ہیں جن کی انگلی تھامے وہ فنکار خود بھی مخصوص لمحوں میں جامد رہا کیونکہ یہی کسی فن کی معراج ہے کہ آپ اپنے کام کو اس طرح کریں کہ وہ کام ساری زندگی آپ کے کام آتا رہے۔ دلیپ کمار نے اپنا کام بہت دل لگا کر کیا اور جب محسوس ہوا کہ یہ کام ان کے بس میں نہیں رہا تو بہت خاموشی کے ساتھ اس کام سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ابتدائی زندگی

دلیپ کمار کی پیدائش غیر منقسم ہندوستان کے دور میں پشاور شہر کی ہے جو برِصغیر پاک و ہند کے بہت سارے بڑے بڑے فلمی ستاروں کا آبائی شہر رہا ہے۔ وہ ۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پشاور کے پشتون خاندان میں پیدا ہوئے اور ۷ جولائی ۲۰۲۱ء کو ۹۸ برس کی عمر میں ان کی رحلت ممبئی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام لالہ غلام سرور اور والدہ کا نام عائشہ بیگم تھا۔ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں ان کا آبائی گھر آج بھی موجود ہے، جہاں انہوں نے اپنے بچپن کے معصوم دن گزارے۔ وہ دن جب وہ اپنی والدہ سے شاید پوچھا کرتے تھے کہ یہ سورج کہاں سے طلوع ہوتا ہے اور پھر یہ کہاں غروب ہوجاتا ہے۔ زندگی کی رعنائیاں محسوس کرنے والے دل کی تڑپ ان کو فنِ اداکاری کی طرف لے آئی۔ انہوں نے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ برطانوی فوج کی کینٹین میں ملازمت بھی کی۔ وہ کم عمری میں ہی پشاور سے ممبئی چلے آئے اور تلاشِ معاش میں مصروف رہے۔ اسی عرصے میں تقدیر ان کو معروف اداکارہ اور بمبئے ٹاکیز جیسے فلم ساز ادارے کی مالکن 'دیوکا رانی' تک لے آئی جنہوں نے ان کو دلیپ کمار کا نام عطا کرنے اور فلم 'جوار بھاٹا' میں پہلی بار ہیرو کا کردار بھی دیا۔ ۱۹۴۴ء میں دلیپ کمار کی یہ پہلی فلم باکس آفس پر کامیابی تو حاصل نہ کرسکی لیکن فلم سازوں کی گھاگ نظریں پہچان چکی تھیں کہ یہ اداکار بہت آگے جانے والا ہے۔ یہی یوسف خان بولی وڈ کا پہلا کامیاب خان ہیرو ثابت ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں فلم 'جگنو' میں میڈم نور جہاں کے ساتھ کام کیا، اس فلم کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی تھے۔ ۱۹۴۹ء میں فلم 'انداز' میں راج کپور اور نرگس کے ساتھ فن اداکاری کے جوہر دکھائے، محبوب خان کی بنائی ہوئی اس فلم کو بھی بہت مقبولیت ملی۔ دلیپ کمار کی شہرت کا پرندہ اب پرواز بھرنے لگا تھا۔ ہندوستانی اور پاکستانی سینما کی تاریخ میں ۴۰ء کی دہائی سے لے کر ۷۰ء کی دہائی تک کے دور کو فلموں کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے اور یہی دور دلیپ کمار کے کیریئر کا بھی سنہری دور تھا۔ انہوں نے میتھڈ ایکٹنگ کے انداز کو ہندوستانی سینما میں متعارف کروایا۔ اپنی ایک فلم 'کوہ نور' کے لیے انہوں نے ستار بجانے کی تربیت حاصل کی، وہ اپنے کرداروں کے لیے ایسی باریک بینی سے ریاضت کرتے تھے۔

اداکاری اور المیہ نگاری کے شہنشاہ

۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں ہی ان کی فلمیں 'دیدار' اور 'داغ' نمائش پذیر ہوئیں، پھر ۱۹۵۵ء میں ان کی فلم 'دیوداس' ریلیز ہوئی، گویا اس نے ان کی فلمی تقدیر کی کایا ہی پلٹ دی۔

اس فلم سے دلیپ کمار ایک اداکار سے بڑھ کر اداکاری اور المیہ نگاری کے شہنشاہ ثابت ہوئے۔ یہاں سے بیدار ہونے والی اس فنی لہر نے کئی مراحل طے کیے اور پھر ۱۹۶۰ء میں ریلیز ہونے والی فلم 'مغلِ اعظم' میں انہوں نے گویا اداکاری کے بامِ عروج کو پالیا۔ یہ ایسی بلندی تھی جہاں تک دلیپ کمار خود بھی دوبارہ پھر نہ پہنچ سکے۔ مغلِ اعظم فلم میں شہزادہ سلیم کے کردار نے صرف اردو سینما کے فلم سازوں اور فلم بینوں کو ہی نہیں بلکہ مغربی فلم سازوں کو بھی متاثر کیا۔ ان میں سرفہرست برطانوی فلم ساز 'ڈیوڈ لین' تھے۔ یہی وہ فلم ساز تھے جنہوں نے 'لارنس آف عربیہ' فلم بنائی تھی، اس میں جو کردار مصری اداکار عمر شریف نے ادا کیا تھا اس کی پیشکش دلیپ کمار کو بھی کی گئی تھی۔ اگر وہ اس وقت اس کردار کے لیے ہامی بھر لیتے تو بہت ممکن ہے کہ اس فلم کے بعد ان کا کیریئر ہولی وڈ میں بھی چل پڑتا کیونکہ ان کو انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور تھا۔ بچپن سے انگریزی فلموں اور انگریز اداکاروں کی پسندیدگی کی وجہ سے وہ اس طرز کے سینما کا فہم بھی رکھتے تھے۔ ان کو ہولی وڈ اور برطانوی سینما کے مزاج کا اندازہ تھا مگر پھر بھی انہوں نے اس اہم فلم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اسی برطانوی فلم ساز نے 'تاج محل' نامی ایک اور فلمی منصوبہ شروع کرنا چاہا جس میں ہولی وڈ کی مایہ ناز اداکارہ الزبتھ ٹیلر کے مدِمقابل دلیپ کمار کو کاسٹ ہونا تھا لیکن یہ منصوبہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر منسوخ ہوگیا۔ دلیپ کمار نے اپنے فلمی کیریئر میں گنگا جمنا، مدھومتی، رام شیام، نیا دور، ودھاتا، کرانتی، کرما، سوداگر اور شکتی نامی فلموں سے بھی نام کمایا۔ آخری فلم قلعہ کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ملی۔ دلیپ کمار اس بات کو محسوس کر چکے تھے اسی لیے خاموشی سے فلمی منظرنامے سے ہٹ گئے۔ فلمی منظرنامے پر ایک طرف دلیپ کمار نے اپنے فن کی جادوگری کو طویل عرصے تک قائم رکھا تو دوسری طرف وہ زندگی کے اصل کرداروں سے بھی ہم کلام ہوتے رہے۔ ان کے حقیقی جذبات، فلمی کہانیوں سے کہیں زیادہ شدت میں تھے۔ انہوں نے محبت کے سفر میں کئی منزلیں طے کیں، کامنی کوشل سے شروع ہونے والی محبت کی کیفیت مدھوبالا، وجنتی مالا سے ہوتی ہوئی سائرہ بانو تک پہنچی۔ زندگی کی کہانی میں حقیقی شریکِ حیات سائرہ بانو ہی ٹھہریں، ایک عارضی شادی کے تحت اسما نامی خاتون سے تعلق استوار ہوا لیکن دیرپا ثابت نہ ہوا اور علیحدگی ہوگئی۔ مدھوبالا سے پروان چڑھنے والی محبت شاید کوئی حتمی رُخ اختیار کر لیتی لیکن اس معاملے میں دلیپ کمار کی شخصی انا آڑے آ گئی جس سے مدھوبالا کا کیریئر اور صحت دونوں کسی حد تک تباہ ہوئے۔ اس بات کا دلیپ کمار کو بھی غم تھا اور وہ اس کو اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے مدھوبالا کو زندگی کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ دلیپ کمار سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی خواتین میں مدھوبالا ہی سرفہرست رہے گی۔

کیریئر کا زوال

دلیپ کمار کی اداکاری سے مزین ۲ مکمل تیار فلمیں 'آگ کا دریا' اور 'کلنگا' نامعلوم وجوہات کی بنا پر ریلیز نہیں ہوسکیں، ان میں سے فلم 'کلنگا' کی ہدایات بھی دلیپ کمار نے دی تھیں۔ یہ ان کی واحد فلم ہے جس میں وہ بطور ہدایت کار کام کرتے نظر آئے۔ اسی طرح ایک فلم 'شکوہ' بھی ہے، جو دلیپ کمار کی نامکمل فلم ہے، جس میں ان کے مدِمقابل اداکارہ 'نوتن' تھیں۔ سبھاش گھائے کی ایک فلم 'مدر لینڈ' میں بھی وہ امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کے ساتھ کاسٹ میں تھے مگر پھر اس فلم سے انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ۷۰ء کی دہائی سے دلیپ کمار کا کیریئر زوال پذیر ہونا شروع ہوا جس کی ایک بدترین مثال ان کی فلم 'داستان' تھی۔ اس فلم کے خسارے اور باکس آفس پر شدید ناکامی نے واضح کر دیا تھا کہ اب دلیپ کمار کا سحر ٹوٹ رہا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، دلیپ کمار نے دیوداس اور مغلِ اعظم جیسی فلموں کے ذریعے اپنا امیج اس قدر بلند کر دیا تھا کہ اس کے بعد آنے والی فلمیں ان کی کارکردگی دکھا نہیں پا رہی تھیں۔ یا یوں کہیں، فلم بینوں کے دل پر ان کے دیگر کردار اثر انداز نہیں ہو رہے تھے۔ دلیپ کمار کی سوانح حیات 'دی سبسٹینس اینڈ دی شیڈو' کو پڑھ کر ان کی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ پاکستان نے دلیپ کمار کو سب سے بڑا سول ایوارڈ 'نشانِ امتیاز' عطا کیا جبکہ بھارت نے بھی ان کو پدما بھوشن، دادا صاحب پھالکے جیسے عظیم ایوارڈز سمیت ۸ فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا جو اپنی جگہ فلمی دنیا میں ایک ریکارڈ ہے۔ دلیپ کمار واحد ہندوستانی فنکار تھے جن کو پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ برابر کی عزت اور شہرت ملی۔ وہ ۲ مرتبہ پاکستان آئے، پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۸ء میں، مگر وہ اپنا گھر پہلی آمد کے موقع پر تو دیکھ سکے تھے دوسری مرتبہ ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوا، اس لیے صرف اپنے رشتے داروں سے ملاقات کی اور پشاور شہر کی سیر کر کے لوٹ آئے۔ ان کے آبائی گھر کو دیکھنے کا راقم کو بھی موقع ملا، اس گھر کی خستہ حالی دیکھ کر افسوس ہوا تھا، شکر ہے کہ اب حکومتی سطح پر یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس گھر کو میوزیم کا درجہ دے دیا جائے گا۔ اب دیکھیں یہ خواب کب شرمندہ تعبیر ہوتا ہے۔ کسی فنکار کے فن کا اعتراف کرنے کے لیے یہ بہت اچھی روایت ہوگی، جس کی ہمارے ہاں اشد ضرورت ہے۔ پشاور کے ثقافتی محقق اور پشاور شہر کے فلمی پس منظر پر گہری نظر رکھنے والے دانشور ابراہیم ضیا خان نے ہم سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ، 'دلیپ کمار ۲ مرتبہ پشاور آئے، پورا شہر ان کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا، ان سے اس وقت تو ملاقات نہ ہوسکی مگر بعد میں جب میرا بھارت جانا ہوا تو دلیپ کمار سے ملا۔ اس ملاقات کی یادیں میری زندگی کا انمول سرمایہ ہیں'۔

'میں تو کہیں نہیں گیا'

ان سے ایک بار جب پوچھا گیا 'آپ پشاور سے چلے گئے، تو پشاور شہر کی یاد آتی ہے؟' تو ان کا جواب تھا، 'میں پشاور سے کہاں گیا، میں تو کہیں نہیں گیا، میں تو آج تک پشاور ہی میں ہوں، یہ شہر میری یادوں میں ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح دلیپ کمار ہم سے ظاہری طور پر رخصت ضرور ہوئے ہیں لیکن وہ کہیں نہیں گئے۔ اپنی کہانیوں، اپنے کرداروں، اپنے لب و لہجے، اپنی یادوں اور اپنے محبوب شہر پشاور کی صورت میں ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں۔ ان کے کرداروں کی خوشبو سے پاک و ہند کا فلمستان مہکتا رہے گا اور مغلِ اعظم جیسی فلم مستقبل کے فلم سازوں کو بتائے گی کہ تہذیب یافتہ سینما کیا ہوتا ہے۔ دیوداس جیسی فلم سے آنے والے فنکاروں کو آگہی ہوگی کہ المیہ پر فارم کرنا کسے کہتے ہیں اور کیفیت کی اداکاری کیا ہوتی ہے۔ ۲۰ویں صدی کا سب سے بڑا ہندوستانی فلمی ستارہ غروب ہوا چاہتا ہے۔

امریکا سیاسی تصفیے سے پہلے ہی افغانستان سے فرار کیوں ہوا؟

تحریر: آصف شاہد

افغانستان میں امریکی مشن کے کمانڈر نے ۱۲ جولائی کو چارج چھوڑ دیا اور کابل میں ہونے والی ایک تقریب میں افغان مشن کی کمان سینٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل فرینک میک کنزی کو سونپ دی، یوں افغانستان میں امریکی جنگ کا علامتی اختتام ہو چکا ہے۔ تاہم حالات یہ ہیں کہ افغانستان کے ۴۰۷ اضلاع میں سے ۲۰۰ پر طالبان کا مکمل کنٹرول ہے اور ۱۲۴ اضلاع پر قبضے اور کنٹرول کی جنگ جاری ہے جبکہ باقی اضلاع ابھی تک اشرف غنی انتظامیہ کے کنٹرول میں ہیں۔

فوجی انخلا کی تکمیل کے لیے ۱۱ ستمبر کی ڈیڈلائن مقرر کرنے والے صدر بائیڈن نے ۹ جولائی کو افغانستان سے فوج کی واپسی کی نئی تاریخ دی تھی اور کہا تھا کہ ۳۱ اگست کو فوج کی واپسی مکمل ہو گی لیکن اس سے پہلے ہی واپسی کا کام مکمل ہو چکا ہے۔

صدر بائیڈن نے افغان جنگ کو ناقابلِ فتح قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا مقصد اسامہ بن لادن کو سزا اور دہشتگردی کو امریکا کے لیے خطرہ بننے سے روکنا تھا اور یہ دونوں مقاصد حاصل ہو چکے ہیں۔ صدر بائیڈن نے افغانستان کو ۲۰ سال حالتِ جنگ میں رکھنے اور افغانوں کی بے گناہ ہلاکتوں پر ایک لفظ بھی نہ کہا اور انتہائی 'کاروباری' انداز میں کہا کہ وہ افغان قوم کی تعمیر کے لیے نہیں گئے تھے اور یہ کام افغانوں کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کریں۔

امریکا کی افغانستان سے واپسی انتہائی پُراسرار انداز میں ہوئی۔ امریکیوں نے بگرام ایئربیس رات کے اندھیرے میں بجلی بند کر کے خالی کیا اور مقامی کمانڈر کو اطلاع تک نہ دی۔ اب ۳۱ اگست کی نئی ڈیڈلائن سے پہلے ہی امریکی افغانستان چھوڑ چکے ہیں اور صرف ۶۵۰ امریکی فوجی کابل میں چھوڑے گئے ہیں جو امریکی سفارتخانے کی سیکیورٹی کا کام کریں گے۔

امریکی فوج کے انخلا کے اعلان کے ساتھ ہی طالبان کی پیش قدمی تیز ہو چکی تھی اور وہ ہر روز نیا علاقہ قبضے میں لے رہے تھے لیکن امریکیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دراصل طالبان نے دیہی افغانستان میں پیش قدمی ۲۰۱۴ء سے ہی شروع کر دی تھی جب نیٹو افواج نے جنگی کردار سے کنارہ کشی اختیار کر کے چارج افغان فورسز کے حوالے کیا تھا، اس لیے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امریکیوں کو طالبان کے ارادوں اور افغانستان کے مستقبل کے نقشے کی خبر نہیں تھی تو یہ اس کی کم علمی ہے۔

طالبان نے دیہی اور دُور دراز علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد انہیں اگلے آپریشنز کے لیے اڈوں کے طور پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ انہی دُور دراز کے اضلاع میں طالبان نے نئی بھرتی بھی کی، ان کی تربیت بھی کی اور درست وقت کا انتظار کیا، یہ ممکن نہیں کہ امریکی اس سے بے خبر ہوں۔

افغان طالبان نے امریکیوں کی واپسی اور افغانستان پر کنٹرول کے لیے فوجی اور سفارتی حکمتِ عملی ترتیب دی تھی اور سفارتی حکمتِ عملی ہی ان کی فوجی منصوبہ بندی کے کام آئی۔ ۲۰۱۸ء میں سابق صدر ٹرمپ کی انتظامیہ نے افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور ۲۹ فروری ۲۰۲۰ء کو دوحہ امن معاہدے پر دستخط کیے گئے جس میں افغانستان سے غیر ملکی فوجی انخلا کی ڈیڈلائن یکم مئی ۲۰۲۱ء مقرر کی گئی۔

دوحہ مذاکرات اور معاہدے کو امن کی کامیابی قرار دیا گیا لیکن دراصل ان مذاکرات کا واحد مقصد امریکا کو اس لاحاصل جنگ سے باہر نکالنا تھا۔ ان مذاکرات کے دوران امریکا نے افغانستان میں اپنی سرپرستی میں بنائی گئی کابل حکومت کو بھی شامل نہ کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذاکرات کا مقصد اس لولی لنگڑی حکومت کو مکمل طور پر افغانستان کے مستقبل سے دُور رکھنا اور طالبان کو مضبوط بنانا تھا۔

ری پبلکن صدر ٹرمپ نے دوحہ معاہدہ کیا اور ڈیموکریٹ جو بائیڈن نے اس معاہدے کو 'بُری ڈیل' کہنے کے باوجود اس پر عمل درآمد کیا۔ دوحہ مذاکرات کے دوران طالبان نے فوجی طاقت جمع کرنا شروع کر دی اور امریکیوں کی واپسی کے اعلان کا انتظار کرنے لگے۔ ٹرمپ سے ہونے والے معاہدے کے تحت یکم مئی فوجی انخلا کی ڈیڈلائن تھی لیکن طالبان نے معاہدہ طے پاتے ہی محتاط انداز میں جنگی حکمتِ عملی پر عمل شروع کر دیا تھا اور افغان فورسز پورا سال طالبان کو روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہیں۔ افغان فورسز کو کبھی کبھی امریکی فضائی مدد ملتی تو طالبان کچھ جانی نقصان کے ساتھ پسپا ہو جاتے لیکن امریکی کارروائی

رکتے ہی طالبان کی پیش قدمی شروع ہوجاتی تھی۔ طالبان کو جس قدر وقت اور مہلت درکار تھی امریکی معاہدے نے انہیں مہیا کر دی تھی۔ طالبان کی افغانستان میں پیش قدمی یکم مئی تک تیز تر ہو چکی تھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی پر عمل شروع ہو چکا تھا۔

امریکی انخلا سے پہلے ہی افغان فورسز نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے تھے جبکہ کئی اضلاع اور بارڈر پوسٹس طالبان نے لڑے بغیر ہی قابو کر لیے۔ اب حالت یہ ہے کہ طالبان تاجکستان، ازبکستان، ایران اور پاکستان کے ساتھ بارڈر کراسنگ پر کنٹرول حاصل کر چکے ہیں اور بڑے صوبائی دارالحکومت طالبان کے نشانے پر ہیں۔

شمالی افغانستان میں طالبان کی پیش قدمی ان کی بہترین جنگی حکمتِ عملی کی تصویر ہے۔ اگر شمالی افغانستان پر طالبان کا کنٹرول مضبوط ہوجاتا ہے، جیسے انہوں نے شمال کے بڑے حصے پر قابو پالیا ہے، تو افغان حکومت اپنے روایتی مددگار علاقوں کا کنٹرول کھونے کے بعد مزاحمت کے قابل ہی نہیں رہے گی اور اس کے بکھرنے کا امکان مزید بڑھ جائے گا۔

طالبان اور کابل حکومت کی پوزیشن کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس سال یکم مئی کو طالبان کے کنٹرول میں صرف ۷۳ اضلاع تھے جبکہ حکومت کے کنٹرول میں ۱۱۵ اضلاع تھے، لیکن ۵ جولائی تک صورتحال بدل گئی ہے اور طالبان کا کنٹرول ۷۳ اضلاع سے بڑھ کر ۱۹۵ اضلاع تک پھیل گیا جبکہ کابل حکومت ۱۱۵ اضلاع سے سکڑ کر ۷۵ اضلاع تک محدود ہوگئی ہے۔ یکم مئی کو ۲۱۰ اضلاع میں کنٹرول کے لیے لڑائی جاری تھی اور ۵ جولائی تک لڑائی صرف ۱۲۹ اضلاع تک محدود ہوگئی۔

طالبان کی شمالی افغانستان میں پیش قدمی کابل حکومت میں بیٹھے جنگی سرداروں کے گھر میں گھسنے کے مترادف ہے اور وہ جنگ کو ان کے گھر تک لے گئے ہیں۔ شمالی افغانستان اگر مزاحمت میں ناکام رہا تو مشرق، مغرب اور جنوب میں لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئے گی جبکہ وسطی افغانستان پر بھی طالبان کا قبضہ آسان ہوجائے گا اور طالبان کابل کے دروازے پر ہوں گے۔ شمالی افغانستان جو طالبان کے خلاف مزاحمت کا گڑھ تھا وہ ان کے کنٹرول میں آنے کا ثبوت یہ ہے کہ شمالی اتحاد کا ہیڈ کوارٹر رہنے والا بدخشاں صوبہ طالبان کے قبضے میں ہے۔ بدخشاں کے ۲۸ اضلاع میں سے ۲۶ پر طالبان کا مکمل کنٹرول ہے۔ بدخشاں میں طالبان کی پیش قدمی اس لیے بھی حیران کن ہے کہ کئی اضلاع بغیر لڑائی کے طالبان کے قبضے میں چلے گئے اور وہاں تعینات افغان فورسز نے تاجکستان کی طرف فرار اختیار کر کے طالبان کو راستہ دیا۔

صوبہ تخار میں بھی حالت اچھی نہیں اور ۱۷ میں سے ۱۴ اضلاع پر طالبان کا کنٹرول ہے۔ صوبائی دارالحکومت تالقان کے لیے لڑائی جاری ہے اور طالبان نے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ بدخشاں اور تخار کا مکمل کنٹرول طالبان کے پاس آنا شمالی اتحاد کی جنگی قوت کے خاتمے کے مترادف ہوگا۔ بدخشاں پر قبضے کے بعد شمالی اتحاد کے گھر پنج شیر پر طالبان کا حملہ بھی آسان ہوجائے گا۔

شمالی افغانستان پر جلد از جلد کنٹرول طالبان کی حکمتِ عملی کا حصہ ہے لیکن وہ شمالی افغانستان تک محدود نہیں، جنوب میں طالبان نے کئی اہم اضلاع پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہلمند کے اہم اضلاع گرشک اور ناوہ بارکزائی طالبان کے قبضے میں ہیں۔ قندھار میں شاہ ولی کوٹ اور پنجوائی پر بھی طالبان کا کنٹرول ہے، گرشک پر قبضہ اس لیے اہم ہے کہ یہاں سے کابل کے وفادار ملیشیاز نے صوبائی دارالحکومت لشکر گاہ پر طالبان کا قبضہ روکنے میں مدد دی تھی۔ پنجوائی تحریک طالبان کی جائے پیدائش ہے اس لیے اس کی فتح طالبان کے لیے تزویراتی اور علامتی طور پر اہم ہے۔ پنجوائی اور شاہ ولی کوٹ پر قبضہ طالبان کو قندھار شہر پر گرفت مضبوط کرنے میں مدد دے گا۔ قندھار صوبے میں اسپین بولدک پر بھی طالبان نے چڑھائی کر رکھی ہے جو پاکستان کے بارڈر پر ہونے کی وجہ سے اہم ہے۔

اسپین بولدک طالبان مخالف کمانڈر تادین رزاق کا گڑھ ہے جن کے بھائی عبدالرزاق خان کو طالبان نے اکتوبر ۲۰۱۸ء کے ایک حملے میں ہلاک کیا تھا اور اس حملے کے وقت امریکی کمانڈر جنرل اسکاٹ ملر بھی موجود تھے لیکن وہ بچ نکلے۔ تادین رزاق نے اب تک قندھار کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اسپین بولدک پر حملے کی صورت میں وہ کسی ایک شہر کے دفاع کے قابل ہوں گے۔ کابل حکومت نے طالبان کی پیش قدمی روکنے کے لیے ملیشیاز کو بھی متحرک کیا ہے لیکن جب افغان فورسز ہی پسپائی اختیار کر رہی ہوں تو ملیشیاز کا حوصلہ کون بڑھائے گا۔ طالبان کے لیے بڑا مسئلہ افغان ایئر فورس ہے اور اس کے توڑ کے لیے انہوں نے پائلٹوں کی ٹارگٹ کلنگ شروع کر دی ہے اور اب تک ۷ پائلٹ قتل ہو چکے ہیں جس سے پائلٹوں اور ان کے خاندانوں کا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

ان حالات میں اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکا افغانستان سے کیوں نکلا؟ اس کا جواب صدر بائیڈن نے خود دیا تھا جب انہوں نے افغانستان سے انخلا کے معاہدے پر عمل درآمد کا اعلان کیا تھا۔ صدر بائیڈن نے کہا تھا کہ اس لاحاصل جنگ کو ختم کر کے اب امریکا کی نمبر ون خارجہ پالیسی ترجیح چین پر توجہ دینے کا وقت آ گیا ہے۔

صدر بائیڈن کا خیال ہے کہ اس لاحاصل جنگ پر وسائل اور توانائیاں صرف کرنے کے بجائے امریکا کو درپیش سب سے بڑے چیلنج چین کے مقابلے کے لیے وسائل اور توانائیاں بچائی جائیں۔ امریکا چین کو ابھرتی ہوئی آمرانہ قوت سمجھتا ہے جو عالمی افق پر امریکا کے غروب کا سبب بن سکتی ہے۔ امریکا چین کو ٹیکنالوجی، فوجی اور معاشی میدانوں میں چیلنج کے طور پر دیکھ رہا ہے۔

صدر بائیڈن یا ان سے پہلے صدر ٹرمپ کا گریٹر مشرق وسطیٰ سے نکل کر انڈو پیسفک پر توجہ دینے کا آئیڈیا نیا نہیں۔ سابق صدر اوباما نے بھی عراق جنگ سے نکلنے کا جواز یہی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اب ان کی توجہ کا مرکز ایشیا ہے۔ صدر بائیڈن افغانستان سے فوجی انخلا کے بعد کیا حکمتِ عملی اختیار کرتے ہیں ابھی اس کا سامنے آنا باقی ہے، لیکن بظاہر امریکی وجوہات اور مقاصد بہت زبردست دکھائی دیتے ہیں جو واشنگٹن کے مفاد میں ہیں لیکن افغانستان سے نکلنے کے بعد کیا حقیقت میں امریکی وسائل اور توجہ صرف چین پر رہ سکتی ہے؟ یہ اہم سوال ہے۔

امریکی فوجی انخلا کے جواز میں واشنگٹن کے پاس ۴ دلائل ہیں:

افغانستان سے نکل کر چین پر توجہ دی جاسکتی ہے

فوجی وسائل کو افغانستان سے نکال کر انڈو پیسفک میں بہتر انداز میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چین کے مقابلے کے لیے امریکا کے اعلیٰ عہدیداروں کی سفارتی اور بیوروکریٹک

توجہ چین کے مقابلے کے لیے بہتر انداز میں استعمال کی جاسکتی ہے۔

امریکا افغانستان پر خرچ ہونے والی رقم اپنی ترقی اور چین کے مقابلے کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ ہر ایک دلیل بہت حقیقی نظر آتی ہے لیکن ان کے جائزے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک امریکی فوجی وسائل افغانستان سے نکال کر انڈو پیسفک میں تعینات کرنے کی بات ہے تو صدر بائیڈن نے جب اقتدار سنبھالا تو افغانستان میں امریکی فوجیوں کی تعداد بہت محدود تھی، چند ہزار فوجی افغانستان میں تعینات رکھ کر طالبان کی پیش قدمی کو روکا جاسکتا تھا اور افغان فورسز کا مورال بھی بلند رکھا جاسکتا تھا۔

افغانستان سے فوج نکالنے کے بعد افغانستان کے اندر طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے اور چند ہزار فوجی افغانستان سے نکال کر کہیں اور تعینات کرنے سے بھی عالمی سطح پر طاقت کے توازن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انڈو پیسفک میں امریکی فوجی استعداد بڑھانا پینٹا گون کی ترجیح ہے لیکن افغانستان سے واپس لائے گئے وسائل انڈو پیسفک میں فوجی استعداد بڑھانے کے منصوبے میں سمندر کے اندر قطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ امریکا افغانستان میں آپریشنز بند کرکے انڈو پیسفک پر توجہ کا اشارہ دے رہا ہے اور یہ اشارہ اہم ہے، تو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکا افغانستان میں آپریشنز بند نہیں کررہا بلکہ افغانستان کے باہر سے آپریشنز کا ارادہ رکھتا ہے۔ طالبان کی پیش قدمی کے بعد بائیڈن انتظامیہ امریکی عوام کو یقین نہیں دلاسکتی کہ افغانستان میں دہشتگردی کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اسے دہشتگردی کے خلاف آپریشنز جاری رکھنا پڑیں گے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکا نے 'دُور افق سے' آپریشنز کا اعلان کررکھا ہے۔ اس مقصد کے لیے فوری طور پر مشرقِ وسطیٰ میں موجود فوجی اڈے اور خلیج فارس میں تعینات بحری بیڑے استعمال کیے جائیں گے۔ قطر اور عرب امارات سے کئی گھنٹوں کی پرواز کے بعد آنے والے جنگی طیاروں کے فیول کے اخراجات کا اندازہ لگائیں تو افغانستان کے اندر رہ کر اخراجات سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہوگی۔

افغانستان کے اندر تعینات فوجیوں کی تنخواہیں اور راشن کے اخراجات تو بچائے نہیں جاسکتے کیونکہ وہ جہاں بھی تعینات کیے جائیں گے یہ اخراجات تو وہاں بھی ہوں گے، امریکا الٹا فیول کا خرچ بڑھا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اتنی دُور سے پرواز کرکے آنے والے طیاروں کے پاس کارروائی کا وقت بھی محدود ہوگا اور زمین پر انہیں انٹیلی جنس مدد بھی حاصل نہیں ہوگی۔ ان آپریشنز کے لیے پینٹا گون کو جنگی طیارے بھی بڑھانا پڑیں گے۔ اضافی فائر پاور کے لیے امریکا کو پاکستان کے ساحلوں سے باہر جنگی بیڑہ بھی کھڑا کرنا پڑسکتا ہے اور اس مقصد کے لیے ان دنوں بھی جنوبی بحیرہ چین سے یو ایس ایس رونالڈ ریگن کو پاکستان کے قریب سمندر میں تعینات رکھا گیا ہے۔

امریکا کے 'دُور افق سے' آپریشنز میں اتحادی بھی زیادہ حصہ ڈالنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اس سے پہلے افغانستان میں امریکی فوجیوں کی تعداد اتحادی فوجیوں کی مجموعی تعداد سے کم تھی۔ اب فضائی آپریشنز اور نگرانی کی ضرورت ہوگی اور اتحادی امریکا کے برابر وسائل اور استعداد نہیں رکھتے۔ جہاں تک سفارتی اور بیوروکریسی سطح پر امریکا کو چین پر توجہ مرکوز کرنے کا معاملہ ہے تو ویسا بھی بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ فوجی انخلا کے فیصلے کے بعد سے ہی امریکا کو سفارتی اور محکمانہ سرگرمیاں بڑھانی پڑی ہیں اور اعلیٰ امریکی عہدیدار انخلا کے بعد کی حکمتِ عملی کے لیے سر کھپا رہے ہیں۔ امریکا کے مددگار افغانوں کو بسانے کا مسئلہ امریکی عہدیداروں کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ امریکا کو خطے میں نئے اڈے درکار ہیں جہاں سے افغانستان میں فضائی آپریشنز کیے جاسکیں اس کے لیے امریکی دفاعی وسفارتی حکام دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

وسطی ایشیا کے ملکوں کے ساتھ نا ختم ہونے والے مذاکرات جاری ہیں اور روس وسطی ایشیا میں امریکی اڈوں میں بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ کابل ایئر پورٹ کی سیکیورٹی مستقل دردِ سر ہے اگرچہ ترکی اس کے لیے تیار ہے لیکن طالبان اسے بھی دھمکیاں دے رہے ہیں اور ترکی ابھی تک ان دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لارہا کیونکہ ترکی روس سے دفاعی میزائل نظام خریدنے کے بعد سے واشنگٹن میں اثر کھوچکا ہے اور کابل ایئر پورٹ کی سیکیورٹی کے لیے رضامندی ظاہر کرکے بائیڈن انتظامیہ کے ساتھ تعلقات میں بہتری کے ساتھ ساتھ یورپی یونین میں پوزیشن بہتر بنانے کا خواہاں ہے۔

ان حالات میں امریکا کے وسائل کی بچت کسی طرح بھی نظر نہیں آرہی اور چین پر توجہ کے لیے وقت، وسائل اور توانائی بچانے کی دلیلیں پُرکشش تو ہیں لیکن عملی طور پر کارگر نہیں۔ وسائل بچانے کی بات اس لیے بھی درست نہیں کہ امریکا کے بجٹ میں افغان فورسز اور حکومت کے لیے رقم بڑھادی گئی ہے طویل فاصلے سے فضائی آپریشنز کے لیے آنے والے جنگی طیاروں کے آپریشن اور مرمت کے اخراجات الگ ہیں۔ اگر خطے میں اڈے مل گئے تو ان کے اخراجات الگ سے ہوں گے اور میزبان ملکوں کی فرمائشیں اپنی جگہ۔

چین کا معاشی، ٹیکنالوجی اور فوجی مقابلہ واشنگٹن کی ترجیح ضرور ہے لیکن مقابلے کا جو پلان اب تک نظر آرہا ہے وہ قابلِ عمل نہیں۔ واشنگٹن کابل سے نکل رہا ہے تاکہ بیجنگ کا مقابلہ کرسکے اور بیجنگ امریکی انخلا سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کی تیاری میں ہے۔

بیجنگ اپنے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے افغانستان کی کڑی جوڑنا چاہتا ہے اور پاکستان میں بنائے گئے سی پیک منصوبوں کو وسطی ایشیا سے جوڑنے کے لیے افغانستان کی راہداری اس کی ضرورت ہے۔ بیجنگ نے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے اشرف غنی انتظامیہ سے مذاکرات شروع کررکھے ہیں اور افغان طالبان بھی بیجنگ کے رابطے میں ہیں۔ یوں کوئی بھی فریق جو افغانستان پر عملداری قائم کرے گا چین ان سب سے رابطے میں ہے۔ کابل انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات میں بیجنگ کا سب سے بڑا منصوبہ پشاور، کابل موٹروے ہے، اور اس پر بات جاری ہے۔

پشاور کابل موٹروے کا بننا عملی طور پر افغانستان کو سی پیک سے جوڑنے کے مترادف ہوگا۔ امریکا کے جانے کے بعد کابل انتظامیہ چین کے خیرمقدم کو تیار ہے۔ چین کابل انتظامیہ اور طالبان کے علاوہ ہر بااثر افغان سیاستدان کو اعتماد میں لے رہا ہے۔ چین کی سرمایہ کاری کو ہر افغان فریق ایک زبردست موقع کے طور پر دیکھ رہا ہے جس سے افغانستان میں معاشی سرگرمی بڑھے گی اور نوجوانوں کو روزگار میسر آئے گا۔

چین افغانستان میں پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرکے معاشی فوائد سمیٹنا چاہتا ہے لیکن اس کی کامیابی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ چین کو امریکا کی نسبت بہتر مواقع میسر

آسکتے ہیں۔ چین کو مشکل خطوں اور ملکوں میں کام کرنے کا تجربہ ہے اور ان کی پالیسی اور کام کرنے کا طریقہ امریکیوں سے مختلف ہے، لہٰذا ان کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چین کو ناکام ہونے میں امریکا سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ چین نے اس سے پہلے جہاں مشکل علاقوں میں کامیابیاں سمیٹی ہیں وہ اس سے بہت دُور تھے اور ناکامی کی صورت میں چین کا نکلنا آسان تھا۔

افغانستان میں قدم جما کر چین صرف معاشی فوائد نہیں چاہتا بلکہ اس کی سیکیورٹی کے لیے بھی افغانستان اہم ہے۔ چین سنکیانگ میں علیحدگی پسندی کو روکنا چاہتا ہے اور طالبان کے اقتدار کی صورت میں وہ انہیں سنکیانگ سے دُور رکھنا چاہتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ طالبان اکیلی طاقت نہیں اور افغانستان میں کئی جنگجو دھڑے ہیں جو چین کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔ ان دھڑوں کو بھارت چین کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ چین جس قدر پاؤں پھیلائے ہوئے ہے اس پر اس کی استعداد سے زیادہ وزن ہے اور افغانستان میں پاؤں پھیلا کر چین یہ وزن بڑھا لے گا۔ اگر چین افغانستان کے اندرونی مسائل میں دھنس گیا تو ایک اور بڑی طاقت افغانستان کے قبرستان میں دفن ہو سکتی ہے اور شاید امریکا بھی یہی چاہتا ہے۔ افغانستان سے امریکی انخلا سے متاثر ہونے والوں میں پاکستان اور چین کے علاوہ تیسرا بڑا فریق روس ہے۔ وسطی ایشیا کو کوئی بھی سیکیورٹی خطرہ روس کے لیے براہِ راست خطرہ ہے اور ماسکو کو اس کا ادراک ہے۔ افغانستان کی لڑائی اگر خانہ جنگی میں بدلی تو مہاجرین کا سیلاب وسطی ایشیا کا رخ کرے گا اور سنٹرل ایشیا کی ریاستوں کے لیے افغان بارڈر سے سیکیورٹی مسائل بھی جنم لیں گے۔ روس نے تاجکستان بارڈر پر حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی فوج بھی وہاں تعینات کر دی ہے۔ ازبکستان بھی اس خطرے سے دوچار ہے، وسطی ایشیا کی ریاستیں روس کے ساتھ سیکیورٹی معاہدے میں شامل ہیں اور روس ان ریاستوں کا دفاع اپنے ملکی دفاع کے لیے لازمی تصور کرتا ہے۔ تاجکستان اور قازقستان میں روس کے فوجی اڈے موجود ہیں۔ تاجکستان نے ۲۰ ہزار اضافی فوجی سرحدوں پر تعینات کر دیے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ ترکمانستان کے لیے ہے جو افغانستان کے ساتھ بارڈر کو محفوظ نہیں بنا سکا۔ روس افغانستان میں براہِ راست فوجی مداخلت کے بجائے سرحدی ریاستوں کے دفاع کو مضبوط بنانے کی کوشش میں ہے۔ طالبان کو دہشتگرد گروپ تصور کرنے کے باوجود ماسکو کئی بار طالبان کی میزبانی کر چکا ہے اور حالیہ دورے میں طالبان نے یقین دہانی کروائی ہے کہ وہ روس کے لیے خطرہ نہیں بنیں گے اور افغان زمین کو روس کے خلاف استعمال ہونے سے روکیں گے۔

روس کے لیے ایک اور بڑا خطرہ وسطی ایشیا میں امریکی یا نیٹو فورسز کی تعیناتی ہے۔ روس کے وزیرِ خارجہ بار بار کہہ رہے ہیں امریکا افغانستان کے گرد فوجی موجودگی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور وسطی ایشیا کی ریاستیں روس کے ساتھ معاہدے کے تحت امریکا کو اڈے نہیں دے سکتیں۔ روس امریکا کو افغانستان میں کئی مواقع پر زک پہنچا چکا ہے اور روس کی طرف سے امریکیوں کے قتل پر انعام کی رپورٹس بھی سامنے آئیں۔ روس کے کچھ حلقے امریکا کو افغانستان سے نکلتا دیکھنا چاہتے تھے لیکن اب ان کی خواہش اور کوشش بیک فائر کر چکی ہے اور روس کے لیے نئے خطرات سر اٹھا رہے ہیں۔ امریکا کو افغانستان سے نکالنے کی خواہش اور کوشش صرف روس کو بھاری نہیں پڑی بلکہ خطے کے تمام ملکوں کے لیے بیک فائر ہے۔ یہی حال ایران کا ہے جو امریکا کو افغانستان میں ناکام دیکھنا چاہتا تھا اور طالبان کو خفیہ مدد بھی دیتا رہا۔ طالبان کے سابق امیر ملا اختر منصور ایران کے دورے سے واپسی پر امریکی ڈرون حملے میں مارے گئے تھے۔ لیکن ایران اب طالبان کے اقتدار میں آنے سے ڈر رہا ہے، اور طالبان کے ساتھ مذاکرات اور سفارتی رابطے ایران کے اس ڈر کا مظہر ہیں۔ اس بار طالبان اقتدار میں آئے تو ان کے کئی ملکوں کے ساتھ سفارتی روابط ہوں گے۔ ایران، چین اور روس اپنے سیکیورٹی مسائل کی وجہ سے طالبان کو تسلیم کرنے کے اشارے بھی دے چکے ہیں۔ وسطی ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ بھی طالبان کے سفارتی روابط موجود ہیں اور حال ہی میں طالبان نے ان ملکوں کے دورے بھی کیے ہیں۔

طالبان کا اقتدار میں آنا یا خانہ جنگی پاکستان کے مفاد میں بھی نہیں۔ پاکستان کی اعلیٰ قیادت کھل کر کہہ رہی ہے کہ تحریک طالبان پاکستان بھی افغان طالبان کا حصہ بن چکی ہے اور پاکستان کو سیکیورٹی خطرات درپیش ہیں کیونکہ تحریک طالبان پاکستان کی جڑیں پاکستان کے اندر ہیں۔ مہاجرین کا نیا سیلاب پہلے سے رجسٹرڈ ۱۴ لاکھ افغان مہاجرین کی تعداد کو کئی گنا بڑھا سکتا ہے جو پاکستان کی معیشت کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔ طالبان کا اقتدار میں آنا پاکستان کے اندر موجود انتہاپسند گروہوں کے حوصلے بھی بڑھائے گا۔ پاکستان کی قیادت نے کئی برسوں سے یہ مؤقف اپنا رکھا تھا کہ افغان مسئلے کا کوئی فوجی حل نہیں۔ امریکا کی واپسی سے بظاہر یہ موقف درست نظر آیا۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا پاکستان اس صورتحال کے لیے تیار تھا تو مایوس کن جواب ملتا ہے۔ اب پاکستان کو شکایت ہے کہ امریکا سیاسی تصفیے سے پہلے ہی بھاگ نکلا ہے۔ حالات اس تیزی سے کروٹ لے رہے ہیں کہ اب پاکستان کے پاس تیاری کا وقت ہی نہیں بچا۔ افغان طالبان کے ترجمان نے رائٹرز سے انٹرویو میں انکشاف کیا کہ ان کے پاس سیاسی تصفیے کا کوئی پلان ہے اور ایک ماہ میں تحریری طور پر وہ یہ پلان کابل انتظامیہ کو پیش کر دیں گے۔ اگر یہ درست ہے اور پلان تمام فریقوں کے لیے قابلِ قبول ہوا تو پاکستان کچھ بہتری کی توقع کر سکتا ہے۔ افغان طالبان کے امن منصوبے پر اشرف غنی انتظامیہ کا راضی ہونا محال نظر آتا ہے اور اشرف غنی انتظامیہ میدانِ جنگ میں ناکامیوں کے باوجود امن منصوبے کی مزاحمت کر سکتی ہے۔

سابق افغان صدر حامد کرزئی نے کہا ہے کہ جلد بامعنی امن مذاکرات شروع ہونے کی توقع ہے۔ اشرف غنی انتظامیہ اس موقع کو ضائع نہ ہونے دیں۔ افغان میڈیا کے مطابق اس ہفتے کے اختتام پر ۱۱ سینئر سیاستدانوں کا وفد مذاکرات کے لیے دوحہ روانہ ہو رہا ہے۔ اس وفد میں عبداللہ عبداللہ، حامد کرزئی، یونس قانونی، کریم خلیلی، محمد محقق، سلام رحیمی، عبدالرشید دوستم، گلبدین حکمت یار، سید سادات منصور نادری، عنایت اللہ بلیغ کے علاوہ فاطمہ گیلانی بھی شامل ہوں گی۔ اگر حامد کرزئی کا اندازہ درست ہے اور انہیں کسی طرف سے سنجیدہ مذاکرات کی یقین دہانی ملی ہے تو یہ اچھی خبر ہے لیکن کرزئی کا انتباہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ فریقین اس موقع کو ضائع نہ ہونے دیں۔

صدیوں سے اخلاقیات کا درس دیتی روشن روشن حکایاتِ سعدیؒ

مرسلہ: ابن قدسیؔ

حماقت کا انجام

ایک بیوہ رئیس زادی کی دو کنیزیں تھیں جن سے وہ گھر کا کام لیتی تھی۔ یہ دونوں کنیزیں سست، کاہل اور کام چور تھیں۔ انہیں کام کرنے سے سخت نفرت تھی۔ خاص طور پر صبح سویرے اٹھنا تو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

ان کی مالکہ انہیں مرغ کی اذان پر جگا دیتی کہ اٹھو، صبح ہوگئی ہے۔ گھر کا کام کرو۔ ادھر مرغ کی اذان کا کیا وہ تو آدھی رات گئے ہی اذان دینے لگتا۔

دونوں کنیزوں نے تنگ آ کر مرغ کو جان سے مار دینے کا فیصلہ کیا۔ کہ نہ یہ ہوگا نہ اذان دے گا اور وہ دن چڑھے تک مزے کی نیند سوئیں گی۔ ایک دن دونوں کنیزوں نے مالکہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرغ کو پکڑ کر مار ڈالا اور ایک جگہ دبا دیا۔ اب ہوا یہ کہ مرغ کے نہ ہونے سے بیوہ کو وقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔ وہ کنیزوں کی جان کھانے لگی اور انہیں نصف شب کو جگانے لگی۔

حاصل کلام

غیر ضروری چالاکی اور ہوشیاری کا نتیجہ ہمیشہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔

ادلے کا بدلہ

ایک لومڑی ایک چیل کی سہیلی بن گئی۔ دونوں میں اتنا پیار ہوا کہ ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہو گیا۔ ایک دن لومڑی نے چیل سے کہا۔

کیوں نہ ہم پاس رہیں۔ پیٹ کی فکر میں اکثر مجھے گھر سے غائب رہنا پڑتا ہے۔ میرے بچے گھر میں اکیلے رہ جاتے ہیں اور میرا دھیان بچوں کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ کیوں نہ تم یہیں کہیں پاس ہی رہو۔ کم از کم میرے بچوں کا تو خیال رکھو گی۔

چیل نے لومڑی کی بات سے اتفاق کیا اور آخر کار کوشش کر کے رہائش کے لیے ایک پرانا پیڑ تلاش کیا جس کا تنا اندر سے کھوکھلا تھا۔ اس میں شگاف تھا۔ دونوں کو یہ جگہ پسند آئی۔ لومڑی اپنے بچوں کے ساتھ شگاف میں اور چیل نے پیڑ پر بسیرا کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد لومڑی کی غیر موجودگی میں چیل جب اپنے گھونسلے میں بچوں کے ساتھ بھوکی بیٹھی تھی، اس نے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے لومڑی کا ایک بچہ اٹھایا اور گھونسلے میں جا کر خود بھی کھایا اور بچوں کو بھی کھلایا۔ جب لومڑی واپس آئی تو ایک بچہ غائب پایا۔ اس نے بچے کو ادھر ادھر بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ آنکھوں سے آنسو بہانے لگی۔ چیل بھی دکھاوے کا افسوس کرتی رہی۔

دوسرے دن لومڑی جب جنگل میں پھر شکار کرنے چلی گئی اور واپس آئی تو ایک اور بچہ غائب پایا۔ تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کا ایک اور بچہ غائب ہو گیا۔ چیل لومڑی کے سارے بچے کھا گئی۔ لومڑی کو چیل پر شک جو ہوا تھا، وہ پختہ یقین میں بدل گیا کہ اس کے تمام بچے چیل ہی نے کھائے ہیں مگر وہ چپ رہی۔ کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔ ہر وقت روتی رہتی اور خدا سے فریاد کرتی رہتی کہ۔

اے خدا! مجھے اڑنے کی طاقت عطا فرما تا کہ میں اپنی دوست نما دشمن چیل سے اپنا انتقام لے سکوں۔ خدا نے لومڑی کی التجا سن لی اور چیل پر اپنا قہر نازل کیا۔ ایک روز بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر چیل تلاش روزی میں جنگل میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ ایک جگہ دھواں اٹھتا دیکھ کر جلدی سے اس کی طرف لپکی۔ دیکھا کچھ شکاری آگ جلا کر اپنا شکار بھوننے میں مصروف ہیں۔

چیل کا بھوک سے برا حال تھا۔ بچے بھی بہت بھوکے تھے صبر نہ کر سکی۔ جھپٹا مارا اور کچھ گوشت اپنے پنجوں میں اچک کر گھونسلے میں لے گئی۔ ادھر بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ کچھ چنگاریاں بھی چپکی ہوئی تھیں۔ گھونسلے میں بچھے ہوئے گھاس پھوس کے تنکوں کو آگ لگ گئی۔ گھونسلا بھی جلنے لگا۔ ادھر تیز تیز ہوا چلنے لگی۔ گھونسلے کی آگ نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ چیل اپنا اور اپنے بچوں کا بچاؤ کر سکے۔ وہیں تڑپ تڑپ کر نیچے گرنے لگے۔ لومڑی نے جھٹ اپنا بدلہ لے لیا اور انہیں چبا چبا کر کھا گئی۔

حاصل کلام

جو کسی کے لیے کنواں کھودتا ہے، خود بھی اسی میں جا گرتا ہے۔ اس لیے سیانوں نے کہا ہے کہ برائی کرنے سے پہلے سوچ لے کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

بعد از مرگ واویلا

ریچھ نے ایک بکرا شکار کیا اور کھانے کے لیے بیٹھا۔ اچانک ادھر سے ایک بھوکا شیر بھی آ نکلا اور آتے ہی ریچھ پر حملہ کر دیا۔ ریچھ نے اپنے ہاتھ سے شکار نکلتے دیکھا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے دل میں کہا کہ ایسے مفت خورے شیر سے کیا ڈرنا، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ یہ سوچ کر انتہائی غصے سے دانت کٹکٹاتا ہوا شیر سے الجھ گیا۔ کافی دیر تک دونوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے۔ نہ ریچھ ہار مانتا تھا نہ شیر خوفناک لڑائی جاری رہی۔ دونوں زخموں سے چور چور بے دم ہو کر زمین پر بے سدھ گر گئے۔ ایک چالاک لومڑی کافی دیر سے دور کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ بڑی موقع شناس تھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور بکرے کو اٹھا کر لے گئی۔ شیر اور ریچھ بے بسی سے یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔

حاصل کلام

آئے موقع کو ہاتھ سے گنوانا حماقت ہے۔ بار بار مواقع نہیں ملتے۔ ایک بار موقع کھو کر بعد میں کف افسوس ملنے سے کیا حاصل۔

میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مصر میں دو امیر زادے رہتے تھے۔ ایک نے

علم حاصل کیا اور دوسرے نے مال و دولت جمع کیا۔ آخر کار ایک زمانے کا بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرے کو مصر کی بادشاہت مل گئی۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے اس عالم کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا "میں حکومت تک پہنچ گیا اور تیری قسمت میں غربت و مسکینی آئی۔"

عالم نے کہا "اے بھائی! مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر تجھ سے زیادہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ میں نے پیغمبروں کا ورثہ یعنی علم پایا اور تو نے فرعون وہامان کی میراث یعنی مصر کی حکومت پائی ہے۔

کجا خود شکر ایں نعمت گزارم کہ زور مردم آزاری ندارم

(میں اس نعمت کا شکر کیسے ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی بنی نوع انسان کو مجھ سے فائدہ پہنچتا ہے اور تجھ سے نقصان، پس دیکھ لے خدا کا فضل کس پر زیادہ ہے۔)

اپنے آپ پر بھروسہ کرو

کسی باغ میں ایک کبوتر نے اپنا آشیانہ بنایا ہوا تھا جس میں وہ دن بھر اپنے بچوں کو دانہ چگاتا۔ بچوں کے بال و پر نکل رہے تھے۔ ایک دن کبوتر دانہ چونچ میں دبائے باہر سے آیا تو سارے بچوں نے انہیں تشویش سے بتایا کہ اب ہمارے آشیانے کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔ آج باغ کا مالک اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔

پھل توڑنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ کل میں اپنے دوستوں کو ساتھ لاؤں گا اور ان سے پھل توڑنے کا کام لوں گا۔ خود میں اپنے بازو کی خرابی کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکوں گا۔

کبوتر نے اپنے بچوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ باغ کا مالک کل اپنے دوستوں کے ساتھ نہیں آئے گا۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔

اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔ باغ کا مالک دوسرے روز اپنے دوستوں کے ہمراہ پھل توڑنے نہ آیا۔ کئی روز بعد باغ کا مالک اپنے بیٹے کے ساتھ باغ میں آیا اور کہنے لگا۔

میں اس دن پھل توڑنے نہ آ سکا کیونکہ میرے دوست وعدے کے باوجود نہ آئے لیکن میرے دوبارہ کہنے پر انہوں نے پکا وعدہ کیا ہے کہ کل وہ ضرور آئیں گے اور پھل توڑنے باغ میں جائیں گے۔

کبوتر نے یہ بات بچوں کی زبانی سن کر کہا۔ گھبراؤ نہیں، باغ کا مالک اب بھی پھل توڑنے نہیں آئے گا۔ یہ کل بھی گزر جائے گی۔ اسی طرح دوسرا روز بھی گزر گیا اور باغ کا مالک اور اس کے دوست باغ نہ آئے۔ آخر ایک روز باغ کا مالک اپنے بیٹے کے ساتھ پھر باغ میں آیا اور بولا۔

میرے دوست تو بس نام کے ہمدرد ہیں۔ ہر بار وعدہ کر کے بھی ٹال مٹول کرتے ہیں اور نہیں آتے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنا کام میں خود کروں گا اور کل باغ سے پھل توڑوں گا۔ کبوتر نے یہ بات سن کر پریشانی سے کہا۔ بچو! اب ہمیں اپنا ٹھکانہ کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔ باغ کا مالک کل یہاں ضرور آئے گا کیونکہ اس نے دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔

حاصل کلام

دوسروں پر بھروسہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اپنا کام خود کرنا چاہیے۔

وقت کی نزاکت

کسی مالدار بخیل کا بیٹا بہت سخت بیمار ہو گیا۔ دوا دارو کرنے کے باوجود بھی بخار کا زور نہ اترا تو کسی نیک دل شخص نے اسے مشورہ دیا کہ قرآن مجید ختم کرا دو یا بکرے کا صدقہ دو۔

یہ سن کر مالدار بخیل سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا۔ قرآن مجید ختم کرانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ منڈی دور ہے اور آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہو گا۔

اس کی یہ بات سن کر نیک آدمی نے کہا۔ قرآن مجید ختم کرنا اس لیے پسند آیا کہ قرآن اس کی نوک زبان پر ہے اور روپیہ اس کی جان میں اٹکا ہوا ہے۔

حاصل کلام

بخیل وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھنے کی بجائے ہمیشہ دولت کو دیکھتا ہے خواہ دولت نہ خرچ کر کے نقصان ہی اٹھانا پڑے۔

شیر بہت بیمار ہے

ایک شیر بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گیا اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ بھوک سے جب برا حال ہوا تو کسی لومڑی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ فکر نہ کرو، میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ یہ کہہ کر لومڑی نے پورے جنگل میں مشہور کر دیا کہ شیر بہت بیمار ہے اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ خبر سنتے ہی جنگل کے جانور اس کی عیادت کو آنے لگے۔ شیر غار میں سر جھکائے پڑا رہتا اور عیادت کے لیے آنے والے جانوروں کا شکار کر کے اپنی بھوک مٹاتا رہتا۔

ایک دن لومڑی شیر کا حال احوال پوچھنے کے لیے آئی اور غار کے دہانے پر کھڑی ہو گئی۔ اتفاقاً اس دن کوئی جانور نہ آیا تھا جس کی وجہ سے شیر بھوکا تھا۔ اس نے لومڑی سے کہا۔ باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ اور مجھے جنگل کا حال احوال سناؤ۔ لومڑی نے چالاکی سے جواب دیا۔ نہیں میں اندر نہیں آ سکتی۔ میں یہاں باہر سے آنے وال پنجوں کے نشان دیکھ رہی ہوں لیکن واپسی کے نہیں۔

حاصل کلام

انجام پر ہمیشہ نظر رکھنے والے ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔

غیبت گو سے بچو

کسی عالم سے دریافت کیا گیا۔

اگر کوئی پارسا شخص انتہائی حسین ہو اور کسی بند کمرے میں کسی حسینہ کے ساتھ محو گفتگو ہو۔ ایسے میں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ نفس بھی طلبگار قربت ہو، اور شہوت بھی غالب۔ مقولہ عرب کے مطابق کھجوریں پکی ہیں اور باغبان روکنے والا نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ

ایسی حالت میں پرہیز گاری کی وجہ سے بچا رہے۔
عالم نے جواب دیا۔ اگر اپنے آپ کو خرمستیوں سے بچا بھی لے تو برائی کرنے والوں کی بدخوئی اور ملامت سے نہ بچ سکے گا۔

حاصل کلام

انسان اپنے نفس کی برائی سے بچ سکتا ہے مخالف کی بدگمانی سے نہیں۔

معالج کیا کرے

عجم کے کسی بادشاہ نے ایک اعلیٰ پائے کا حکیم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ وہ حکیم کئی سال مدینہ شریف میں رہا۔ کوئی ایک شخص بھی اس کے پاس علاج کے لیے نہ آیا۔ ایک دن وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں اس شکایت کے ساتھ حاضر ہوا۔
یہ خادم یہاں کے لوگوں کے علاج معالجہ کے لیے آیا لیکن اتنی مدت گزرنے کے باوجود کسی نے میری طرف توجہ ہی نہیں کی اور نہ ہی علاج کے لیے کوئی بیمار میرے پاس آیا ہے۔
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ان کا دستور یہ ہے کہ بلا تیز بھوک کھاتے نہیں اور کھاتے وقت ابھی بھوک باقی ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیتے ہیں۔

حاصل کلام

ہمیشہ تندرست رہنے کا راز یہی ہے کہ بلا تیز بھوک مت کھاؤ اور ابھی بھوک باقی ہو تو اس سے ہاتھ کھینچ لو۔ انسان کبھی بیمار نہیں ہوتا۔

نفس کے تقاضے

کسی غلہ فروش کے چند درہم ایک صوفی پر قرض ہو گئے۔ غلہ فروش ہر روز صوفی سے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرتا اور صوفی کو اچھی طرح ذلیل بھی کرتا۔ ایک دن صوفی کو اس کے ایک دوست نے کہا۔
یہ غلہ فروش تمہیں رقم کے تقاضا میں روز ذلیل کرتا ہے اور تم ٹال مٹول کرتے رہتے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اپنی یہ عادت بنا لی ہے۔ بہتر ہوتا کہ نفس کے تقاضے کو بھی آئندہ کل پر ٹال دیتے اور قرض کی مصیبت میں نہ پڑتے۔

حاصل کلام

وقتی پریشانی دور کرنے کے لیے قرض لینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

خسارہ

حضرت سعدی ایک قافلے کے ہمراہ بیابان قید طے کر رہے تھے کہ ایک پڑاؤ پر قافلہ رکا تو نیند کے غلبے نے ایسا مدہوش کیا کہ قافلے کی روانگی کا احساس نہ ہوا۔ ایک شتر سوار نے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر جگایا اور کہا۔ کیا مرنے کا ارادہ ہے جو یوں غفلت کی نیند سو رہا ہے۔ یاد رکھ، قافلے سے بچھڑنے کی صورت میں اس لق و دق بیابان میں ہی ہلاک ہو جائے گا۔ وقت کسی کی خاطر اپنی رفتار کم نہیں کرتا۔ اس کا ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اسے غفلت کی نیند میں برباد نہ کر۔

حاصل کلام

سفر حیات کی نزاکتوں اور دشواریوں کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے ورنہ بیابان قید کے غافل مسافر کی طرح ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا غفلت میں پڑے ہوئے لوگ اعمال حسنہ کی برکتوں سے خالی دامن کی وجہ سے خسارے میں رہتے ہیں اور عاقبت میں نہ ختم ہونے والا عذاب ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

فلاح کی بات

ایک شخص قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ اس کے عزیز و اقارب رونے دھونے اور سینہ کوبی میں مصروف تھے۔ ایک مرد دانا نے ان کو اس حال میں دیکھ کر کہا کہ بجائے اپنے عزیز کے انجام سے آگاہ ہونے تم الٹا کام کر رہے ہو۔ یاد رکھو! بچہ پاک ہی آیا تھا اور پاک ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ رونا تو اس بات پر آنا چاہیے کہ جب میں اس دنیا میں آیا تھا تو پاک تھا اور جب رخصت ہوں گا تو گناہوں کی ناپاکی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں گا۔ تجھے چاہیے کہ موت آنے سے پہلے اگلے جہاں کی فکر کرتا کہ وہاں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

حاصل کلام

موت نہ ٹلنے والی حقیقت ہے جو ہر حال میں آکر رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ حاصل زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے اچھے اعمال کرنے چاہئیں۔ اس میں فلاح آخرت ہے۔

عمر ضائع نہ کر

ایک نماز، روزے اور ذکرِ الٰہی میں محو رہنے والے شخص کے ہاتھ کہیں سے سونے کی اینٹ پڑی ہوئی لگ گئی جس کی وجہ سے اس کے قلب کی ماہیت ہی بدل گئی۔ خدا کی یاد سے غافل ہو کر اب اس نے ہر وقت دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔ کبھی اعلیٰ شاندار محل، کبھی باغیچہ فردوس، کبھی بہترین طعام اور لباس فاخرہ اور کہیں کچھ اور غرض کہ اس طرح کی سوچوں نے اس کی نیند حرام کر دی۔ اسی پریشان حالی اور سوچوں میں گم وہ ایک دن جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں اس نے ایک شخص کو قبر کی مٹی سے اینٹیں بناتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے دماغ پر چھائی ہوئی ہوس کی گرد چھٹی۔ اس نے سوچا۔
تو بھی کیسا احمق اور بے وقوف ہے۔ سونے کی اینٹ کیا ہاتھ آئی، تو اپنی عاقبت بھی بھول گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کل کو تمہاری قبر کی مٹی سے بھی اسی طرح اینٹیں بنائی جائیں۔ اپنی عمر عزیز ضائع نہ کر اور سیدھی راہ اختیار کر۔

حاصل کلام

دولت حاجات پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے حد سے زائد دولت انسان کے دل کو پتھر بنا دیتی ہے اور یاد الٰہی سے غفلت میں پڑ کر دنیاوی شور و شغب اور لہو و لعب میں ڈوب جاتا ہے۔ اس طرح نہ صرف اپنی عاقبت خراب کرتا ہے بلکہ دنیا میں بھی خسارے میں رہتا ہے۔

❀❀❀

آج کے ظالم مسلمان

تحریر: مقبول احمد سلفی اسلامک دعوۃ سنٹر طائف

اس کائنات کا خالق عظیم عادل ومنصف ہے، وہ اپنے عدل وانصاف سے دنیا والوں کی نگرانی کر رہا ہے بلکہ کائنات کی ساری مخلوقات کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور کسی پر بھی ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا مگر انسان ہے کہ ایک دوسرے پر ظلم کر کے دنیا کا ماحول مکدر بنا دیا ہے۔ آج کل کی صورت حال ایسی ہے کہ شریف انسانوں، نیک دل مسلمانوں اور عدل وانصاف کرنے والے آدمیوں کا یہاں جینا دشوار ہو گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: المؤمنُ غِرٌّ كريمٌ، والفاجرُ خِبٌّ لئيمٌ (صحیح أبی داود: ۴۷۹۰) ترجمہ: مومن بھولا بھالا اور شریف ہوتا ہے اور فاجر فسادی اور کمینہ ہوتا ہے۔ آج اکثر مسلمان اس حدیث کے مخالف اور ظلم وعدوان کی راہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔

اللہ نے ظلم کو اپنے لئے اور اپنی مخلوق کے لئے حرام ٹھہرایا ہے۔ حدیث قدسی میں ذکر ہے :يا عِبَادِي إنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ علَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فلا تَظَالَمُوا (صحیح مسلم: ۲۵۷۷)

ترجمہ: اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا اور تم پر بھی حرام کیا، تو تم مت ظلم کرو آپس میں ایک دوسرے پر۔

اللہ نے اپنے اوپر ظلم حرام کر لیا اور اپنی ذات سے بھی ظلم کی یکسر نفی کر دی، فرمان باری تعالی ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء: ۴۰) ترجمہ: اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا ہے۔

ظلم کہتے ہیں کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کو اس کا حق نہ دینا، ناحق طریقے سے کسی کا حق مارنا، بغیر قصور کے کسی پر زیادتی کرنا، معاملات میں ناحق طرفداری کرنا وغیرہ ظلم کہلائے گا۔ یہ ظلم اس قدر بھیانک جرم ہے کہ اسے قیامت کی تاریکی سے موسوم کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اتَّقُوا الظُّلْمَ، فإنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَومَ القِيَامَةِ (صحیح مسلم: ۲۵۷۸)

ترجمہ: تم ظلم سے بچو کیونکہ یہ قیامت کی تاریکیوں سے ہے یعنی ظالم کو قیامت کے دن بوجہ تاریکی اور اندھیرے کے راہ نہ ملے گی۔

میں اس مضمون میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج دنیا ظلموں سے بھر گئی ہے اور ظلم کا انجام تباہی وبربادی ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ اللہ کی طرف سے قسم قسم کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان تو اللہ پر ایمان لانے والے ہیں پھر وہ کیوں پریشان حال ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج کے اکثر مسلمان ظالم ہیں اور وہ اپنے کرتوت کی وجہ سے اللہ کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ جواب کچھ حیران کرنے والا ہے مگر حقیقت پر مبنی ہے۔ اس جواب کو اچھے سے سمجھنے کے لئے ظلم کی تعریف ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی اقسام کو جاننا ہوگا۔

قرآن نے ظلم کو مختلف طریقے سے بیان کیا ہے اور متعدد قسم کی نافرمانیوں کو ظلم قرار دیا ہے، ان سب کا ذکر طویل ہو جائے گا۔ اختصار کے ساتھ ہم تمام قسم کے ظلموں کو تین اصناف میں بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) ظلم کی پہلی قسم اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ اللہ اس کائنات کا تن تنہا خالق ومالک ہے، وہ محض اپنی عبادت کے لئے انس وجن کو پیدا کیا ہے اس وجہ سے جو رب کی بندگی چھوڑ کر غیر اللہ کی بندگی کرے یا اس کی بندگی میں غیر اللہ کو شامل کرے وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہی نہیں بہت ہی بڑا ظالم ہے کیونکہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا بھاری ظلم ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (لقمان: ۱۳)

ترجمہ: اور جبکہ لقمان نے وعظ کہتے ہوئے اپنے لڑکے سے فرمایا کہ میرے پیارے بچو! اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا بیشک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔

ظلم کی اس قسم کو دنیا کے مسلمانوں میں تلاش کریں تو معلوم ہوگا کہ اکثر مسلمان ظالم ہیں۔ گاؤں گاؤں شہر شہر درگاہوں اور مزاروں پر غیر اللہ کے لئے سجدے ہو رہے ہیں، اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے مدد طلب کی جا رہی ہے اور جن کو خود اللہ نے پیدا کیا ہے ان محتاج وکمزور بندوں کو مشکل کشا/ غوث/ داتا اور غریب نواز سمجھا جا رہا ہے۔ رب العالمین نے سچ فرمایا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے اکثر مشرک ہیں۔ فرمان الہی ہے: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (یوسف: ۱۰۶) ترجمہ: ان میں سے اکثر لوگ باوجود اللہ پر ایمان رکھنے کے بھی مشرک ہی ہیں۔

قرآن کی یہ آیت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ کلمہ پڑھنے والے بھی شرک میں مبتلا ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی دنیا میں کثرت ہے۔ جب اس درجے کے مسلمانوں کی اکثریت ہوگی پھر کیسے نہ ابتلاء وآزمائش میں ہوں گے؟

(۲) ظلم کی دوسری قسم بھی حقوق اللہ سے متعلق ہے اور یہاں پر اس سے مراد اللہ کی وہ معصیت ہے جو شرک کے علاوہ ہو۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیں کہ ہمیں اللہ نے آنکھ سے جائز چیز دیکھنے کا حکم دیا، کان سے اچھی بات سننے کا حکم دیا مگر ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے آنکھوں سے گندی تصویر دیکھتے ہیں اور کانوں سے گانا سنتے ہیں تو یہ اپنی آنکھوں اور کانوں پر ظلم کرنا ہوا، اسی کو اپنے نفس پر ظلم کرنا بھی کہا جاتا ہے یعنی جب بھی انسان اللہ کی معصیت ونافرمانی کا کوئی کام کرتا ہے تو وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتا ہے۔ اس بات کو اللہ تعالی نے قرآن مقدس میں کئی جگہ بیان کیا ہے، پہلے وہ آیت دیکھیں جس میں اللہ بیان کرتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرتا ہے، اللہ فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (یونس: ۴۴)

ترجمہ: یہ یقینی بات ہے کہ اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود ہی اپنی جانوں

پر ظلم کرتے ہیں۔

اور اب وہ آیت دیکھیں جس میں اللہ بتلا رہا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور اس کے حدود سے تجاوز کرنا اپنے نفسوں پر ظلم کرنا ہے۔فرمان رب العالمین ہے:وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ(الطلاق:۱) ترجمہ:جو شخص اللہ کی حدوں سے آگے بڑھ جائے اس نے یقینا اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

ظلم کی اس قسم کو مسلمانوں میں تلاش کرتے ہیں تو گھر گھر اور اکثر مسلمانوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ان دونوں قسموں کے ظلم کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالی توبہ کے ذریعہ شرک اور اپنے حق میں ہونے والی تمام معصیت کو معاف فرمادیتا ہے لیکن شرک پر کسی کا خاتمہ ہوجائے تو پھر اللہ کے دربار سے اس ظلم کی معافی نہیں ملتی ہے،ہمیشہ ہمیش کے لئے اس ظلم کے بدلے جہنم میں جانا پڑے گا تاہم شرک کے علاوہ گناہ کو اللہ چاہے تو معاف کرے اور چاہے تو سزا دے۔ اللہ فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا(النساء:۴۸)

ترجمہ:یقینا اللہ تعالی اپنے ساتھ شریک کئے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔

(۳)ظلم کی تیسری قسم حقوق العباد سے متعلق ہے یعنی ایک آدمی کسی دوسرے آدمی پر کسی قسم کا ظلم کرے مثلا لوگوں ک ناحق خون کرنا،باطل طریقے سے کسی کا حق مارنا، کسی کا سامان چھین لینا یا چوری کرلینا،بلاوجہ کسی کو گالی دیدینا،معصوم آدمی پر بہتان لگانا،لوگوں کا دل دکھانا، کسی کی غیبت اور چغلی کرنا، کمزوروں کو پریشان کرنا،حق کے داعیوں کے لئے مشکلات پیدا کرنا اور مظلوم کے خلاف ظالم کی مدد کرنا وغیرہ۔

ظلم کی تینوں اقسام میں یہ وہ بھیانک جرم ہے جس کو اللہ معاف نہیں کرتا اور نہ ہی نماز وروزہ اور حج وعمرہ جیسی نیکی سے تلافی ہوتی ہے۔نبی صلی اللہ علیہ کا فرمان ہے:

مَن كَانَتْ له مَظْلَمَةٌ لأخِيهِ مِن عِرْضِهِ أَوْ شيءٍ، فَلْيَتَحَلَّلْهُ منه اليَومَ، قَبْلَ أَنْ لا يَكونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، إنْ كانَ له عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ منه بقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وإنْ لَمْ تَكُنْ له حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِن سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عليه(صحیح البخاری:۲۴۴۹)

ترجمہ:اگر کسی شخص کا ظلم کسی دوسرے کی عزت پر ہو یا کسی طریقہ (سے ظلم کیا ہو) تو آج ہی،اس دن کے آنے سے پہلے معاف کرا لے جس دن نہ دینار ہوں گے،نہ درہم بلکہ اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوگا تو اس کے ظلم کے بدلے میں وہی لے لیا جائے گا اور اگر کوئی نیک عمل اس کے پاس نہیں ہوگا تو اس کے (مظلوم) ساتھی کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔اس معنی کی ایک مفصل روایت صحیح مسلم میں یوں وارد ہے،نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

أَتَدْرُونَ ما المُفْلِسُ؟ قالوا: المُفْلِسُ فِينا مَن لا دِرْهَمَ له ولا مَتاعَ، فقالَ: إنَّ المُفْلِسَ مِن أُمَّتي يَأْتي يَومَ القِيامَةِ بصَلاةٍ، وصِيامٍ، وزَكاةٍ، ويَأْتي قدْ شَتَمَ هذا، وقَذَفَ هذا، وأَكَلَ مالَ هذا، وسَفَكَ دَمَ هذا، وضَرَبَ هذا، فيُعْطَى هذا مِن حَسَناتِهِ، وهذا مِن حَسَناتِهِ، فإنْ فَنِيَتْ حَسَناتُهُ قَبْلَ أنْ يُقْضَى ما عليه أُخِذَ مِن خَطاياهُمْ فَطُرِحَتْ عليه، ثُمَّ طُرِحَ في النّارِ.(صحیح مسلم:۲۵۸۱)

ترجمہ:تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟لوگوں نے عرض کیا:مفلس ہم میں وہ ہے جس کے پاس روپیہ اور اسباب نہ ہو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:مفلس میری امت میں قیامت کے دن وہ ہوگا جو نماز لائے گا،روزہ اور زکوۃ لیکن اس نے دنیا میں ایک کو گالی دی ہوگی،دوسرے پر بدکاری کی تہمت لگائی ہوگی،تیسرے کا مال کھالیا ہوگا،چوتھے کا خون کیا ہوگا،پانچویں کو مارا ہوگا،پھر ان لوگوں کو (یعنی جن کو اس نے دنیا میں ستایا) اس کی نیکیاں مل جائیں گی اور جو اس کی نیکیاں اس کے گناہ ادا ہونے سے پہلے ختم ہوجائیں گی تو ان لوگوں کی برائیاں اس پر ڈالی جائیں گی آخر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ظلم کی اس قسم کو مسلمان میں تلاش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گھر گھر ظالم ہے،ہر کوئی دوسرے کے لئے ظالم ہے اور افسوسناک صورت حال تو یہ ہے کہ تقلیدی مسالک میں بٹے مسلمان ایک دوسرے پر ظلم کی انتہا کرچکے ہیں۔اندھی تقلید اور گروہی عصبیت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ دین کے سچے داعیوں اور معصوم علماء کو دہشت گرد قرار دے کر کافروں کے ہاتھوں میں تھمارہے ہیں تاکہ اہل کفر انہیں قتل کردے یا جیل کی سلاخوں میں بند کرکے انہیں دعوت دین سے روک دے۔العیاذ باللہ

اے کاش!خود کو مسلمان کہنے والے اس حدیث کو عمل میں لائے ہوتے تو آج ہم کافروں سے مغلوب نہ ہوتے اور یوں زمانے میں ذلیل وخوار نہ ہوتے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تَحاسَدُوا، ولا تَناجَشُوا، ولا تَباغَضُوا، ولا تَدابَرُوا، ولا يَبِعْ بَعْضُكُمْ علَى بَيْعِ بَعْضٍ، وكُونُوا عِبادَ اللهِ إخْوانًا المُسْلِمُ أخُو المُسْلِمِ، لا يَظْلِمُهُ ولا يَخْذُلُهُ، ولا يَحْقِرُهُ التَّقْوَى هاهُنا ويُشِيرُ إلى صَدْرِهِ ثَلاثَ مَرَّاتٍ بحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أنْ يَحْقِرَ أخاهُ المُسْلِمَ، كُلُّ المُسْلِمِ علَى المُسْلِمِ حَرامٌ، دَمُهُ، ومالُهُ، وعِرْضُهُ(صحیح مسلم:۲۵۶۴)

ترجمہ:مت حسد کرو،مت دھوکے بازی کرو،مت بغض رکھو،مت دشمنی کرو،کوئی تم میں سے دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے اور ہوجاؤ اللہ کے بندو بھائی بھائی۔مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے،نہ اس کو ذلیل کرے،نہ اس کو حقیر جانے،تقویٰ اور پرہیزگاری یہاں ہے۔اور اشارہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف تین بار (یعنی ظاہر میں

عمدہ اعمال کرنے سے آدمی متقی نہیں ہوتا جب تک سینہ اس کا صاف نہ ہو)، کافی ہے آدمی کو یہ برائی کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، مسلمان کی سب چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں اس کا خون، مال، عزت اور آبرو۔

آج ایک مسلمان خود دوسرے مسلمان کے لئے مصیبت بنا ہوا ہے اور ایک گروہ دوسروں کے خون کا پیاسا ہے، یہ سب کچھ دشمنان اسلام کو معلوم ہیں اور وہ خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیا ہو گیا آج کے مسلمانوں کو کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کی بجائے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ رہے ہیں اور اللہ کے دشمنوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اللہ نے ہمیں اپنے بھائیوں کے جھگڑے ختم کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کا حکم دیا جبکہ ہم اس کے برخلاف آپس میں مسلمانوں کو لڑانے میں لگے ہیں اور اپنے بھائیوں کو مٹانے پر تلے ہیں۔ کیا ظالم مسلمان اس آیت کی تلاوت نہیں کرتے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الحجرات:۱۰)

ترجمہ: بے شک سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

ظالم لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ ان کے کرتوت سے غافل ہے، ہرگز نہیں بلکہ وہ ظالموں کے عملوں سے بخوبی واقف ہے، بس تھوڑی مہلت دیتا ہے اور جب تباہی کا وقت آجاتا ہے تو پھر کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ (ابراهيم:۴۲)

ترجمہ: ظالموں کے اعمال سے اللہ کو غافل نہ سمجھ وہ تو انہیں اس دن تک مہلت دئے ہوئے ہے جس دن آنکھیں پھٹی پھٹی رہ جائیں گی۔

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتَّى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ (صحيح البخاري:۴۶۸۶)

اللہ تعالیٰ ظالم کو چند روز دنیا میں مہلت دیتا رہتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔

قرآن ظالموں کی بے شمار داستانیں ہم سے بیان کرتا ہے، بڑے بڑے ظالم دنیا سے نیست و نابود کئے گئے، کہیں ان کا اتہ پتہ اور نام و نشان نہیں ملتا۔

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

کیا نمرود اور کیا فرعون؟ اللہ نے بستیوں کی بستی ہلاک کر دیا، اللہ کا فرمان ہے:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (الانبياء:۱۱)

ترجمہ: اور بہت سے بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔

ظلم کی ہولناکی دیکھیں کہ مظلوم کی آہ و بکا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور پھر مظلوم فاسق و فاجر ہو حتی کہ کافر ہو تب بھی اس کی بد دعا ظالم کے خلاف اللہ قبول کر لیتا ہے۔

اس سے متعلق تین قسم کی احادیث وارد ہیں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

اتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللَّهِ حِجَابٌ. (صحيح البخاري:۲۴۴۸)

ترجمہ: مظلوم کی بد دعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان پردہ نہیں ہوتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

دعوةُ المظلومِ مُستجابةٌ، وإن كان فاجرًا ففجورُه على نفسِه (صحيح الترغيب:۲۲۲۹)

ترجمہ: مظلوم کی دعا قبول کر لی جاتی ہے، اگر وہ فاجر ہوگا تو اس کی برائی اسی کے نفس پر ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اتّقوا دعوةَ المظلومِ، وإن كان كافرًا، فإنه ليس دونها حجابٌ (صحيح الجامع:۱۱۹)

ترجمہ: مظلوم کی بد دعا سے بچو اگرچہ کافر ہو کیونکہ اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

ظلم کا سب سے بھیانک انجام یہ ہے کہ ظالموں کو آخرت میں سزا ملنی ہی ملنی ہے، دنیا میں بھی یقینی طور پر اور ہر حال میں اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے:

ما من ذنبٍ أجدرُ أن يُعجِّلَ اللهُ لصاحبِه العقوبةَ في الدنيا مع ما يدَّخِرُ له في الآخرةِ من البغيِ وقطيعةِ الرحمِ (صحيح ابن ماجه:۳۴۱۳)

ترجمہ: ظلم اور قطع رحمی سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا مرتکب زیادہ لائق ہے کہ اس کو اللہ کی جانب سے دنیا میں بھی جلد سزا دی جائے اور آخرت کے لئے بھی اسے باقی رکھا جائے۔

آخر میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ ہم سب اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، اس گناہ کو اللہ معاف کرسکتا ہے مگر جو گناہ موجب جہنم ہے اس سے تو ہر حال میں بچنا ہوگا۔ آئیے اپنا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم نے کس کس کے حق میں ظلم کیا ہے، اولاد، رشتے دار، پڑوسی، علماء، ان سب سے اپنے جرم کی تلافی کر والیں اور آئندہ مسلمانوں کے حق میں ظلم کرنے سے بچیں حتی کہ کسی کافر یا کسی جانور پر بھی ظلم نہ کریں اور میری بات کا یقین کریں کہ اگر مسلم اپنی زندگی سے ظلم ختم کرلیں اور آپس میں ایمان والے بھائی بن جائیں تو دشمن پر پھر سے غالب آجائیں گے۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران:۱۳۹)

ترجمہ: اور تم سستی نہ کرو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم ایمان والا رہو۔

اور ایک آخری بات آپ سب سے ادباً و احتراماً عرض کرنا ہے کہ مظلوم مسلمان جو جیلوں اور کافروں کے نشانے پر ہیں ان کی مدد کریں خواہ وہ کسی طبقہ اور مسلک سے ہوں اور مسلمانوں میں جو ظالم ہیں ان کو ظلم سے روکیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا. قالوا: يا رَسُولَ اللَّهِ، هذا نَنْصُرُهُ مَظْلُومًا، فَكيفَ نَنْصُرُهُ ظَالِمًا؟ قالَ: تَأْخُذُ فَوْقَ يَدَيْهِ. (صحيح البخاري:۲۴۴۴)

ترجمہ: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم مظلوم کی تو مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم سے اس کا ہاتھ پکڑ لو (یہی اس کی مدد ہے)۔ ❀❀❀